خاموش آسمان

(افسانوی مجموعہ)

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری

خاموش آسمان

(افسانوی مجموعہ)

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

KHAMOSH AASMAN

(A Book of Short Stories)

by

Dr. Neelofer Naaz Nehvi Qadri

Year of Edition 2015

ISBN 978-93-5073-592-3

₹ 300/-

کتاب کا نام	:	خاموش آسمان
مصنفہ	:	ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری
موبائل	:	9906570372
ای میل	:	naaz_neelofer@yahoo.com
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	قادری کمپیوٹرس
سرورق	:	حارث احمد قادری
اشاعت	:	۲۰۱۵ء
قیمت فی جلد	:	۳۰۰ روپے
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)

Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com

website: www.ephbooks.com

خواتین

فِکشن

نگاروں

کے

نام

اکھ چھو کران تژیشہ تژیشہ
اکس پکان آنگنۍ ویتھ
اکسِ تیلس آب گژھان،
اکس آبس نار لگان
مگر یہ آسمان وچھان وچھان ژھوپہ دم کرتھ

نیلوفر نازؔ

ہوائے تُند کے شعلوں میں جسم و جان جلے
خدایا کب میری وادی سے ظلم و قہر ٹلے

ہوئے ہیں قید مکانوں میں سب مقیم یہاں
''چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے''

زاہد مختار

فہرست مضامین

☆☆☆

پیش لفظ

۷۸۶

ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کا تخلیقی سفر بڑی خوبصورتی اور سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ آج یہاں افسانہ لکھنے کی نوعیت بدل چکی ہے۔ آج یہاں لکھے جانے والے افسانے میں نیا ٹریٹمنٹ اور نیا اسلوب ملتا ہے۔ ایک دلچسپ انداز تحریر سامنے آتی ہے۔ اگر چہ عشق ومحبت کی داستانیں بھی پڑھنے کو مل جاتی ہیں لیکن ان میں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں بھی ابھر کر آتی ہیں۔ آج لکھی جانے والی کہانی آج کے انسان کی کہانی ہے۔ آج کے دور کی کہانی ہے۔ یہ ہمارے آج کے سماج اور آج کے سیاسی پس منظر میں جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کہانیوں میں عدم مساوات کا ذکر بھی ملتا ہے اور جنسی بے راہ روی کے خلاف احتجاج بھی۔ یہ احتجاج پہلے کی نسبت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن اس احتجاج میں زبردستی نہیں، خیالات کا ٹکراؤ

نہیں، بلکہ محبت کی چاشنی ملتی ہے۔خلوص واحترام کی فضا ملتی ہے۔ یہ بات سمجھنے اور سمجھانے کی ایک نئی راہ کی تلاش ملتی ہے اور یہ تلاش ہماری آج کی کہانی کی بنیاد ہے۔ بنیاد مطبوعہ ہو تو ظاہر ہے کہ سوچیں بھی مظبوط ہوں گی۔ مثبت نتائج کی حامل ہوں گی۔

زبان وادب سے وابستہ اہل ودانش اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ حقیقی ترقی کے مراکز ہمارے تعلیمی ادارے ہیں۔ اور اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ حقیقی ترقی کے مراکز ہمارے تعلیمی ادارے ہیں اور اس تعلق سے ہمارے اساتذہ کا رول بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اکثر اساتذہ اپنے رول سے بخوبی واقف ہیں اور علم و ادب کی شمع کو دیانت داری، ہوش مندی اور سلیقے سے روشن کرنے میں سرگرمِ عمل ہیں۔ اس تعلق سے اردو پڑھنے اور پڑھانے والے اساتذہ کے رول کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان وادب کے فروغ کے تعلق سے ان کا رول بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو ریاست جموں کشمیر کی آئینی اور سرکاری زبان ہے لیکن اِس کے باوجود سرکاری سطح پر اس زبان کے تعلق سے جو بے حِسی اپنائی جا رہی ہے وہ ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لہذا نئی نسل کے لئے اردو پڑھنا، لکھنا اور بولنا نہایت ہی اہم ہے۔ یہ ہماری نئی نسل ہی ہے جس کو اردو زبان وادب کو زندہ رکھنے کے لئے سامنے آنا ہوگا۔ سرکاری اور غیر سرکاری بے حسی کے خلاف آواز بلند کرنا ہوگی۔ اردو زبان و ادب زندہ ہے تو افسانہ بھی زندہ رہے گا اور افسانہ نگاری بھی!

ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانہ لکھنے والی خواتین کے رول کو نظر انداز

نہیں کیا جاسکتا اگر چہ ہماری خواتین افسانہ نگاروں کی تعداد کم ہے لیکن اُن کا تخلیقی معیار کسی طور بھی کم نہیں۔ یہ تخلیقی معیار اونچائیوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ملکی سطح پر بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ آج جب ہم ملکی سطح پر اردو زبان کی خواتین اردو افسانہ نگاروں کی بات کرتے ہیں تو ریاست جموں کشمیر سے تعلق رکھنے والی خواتین افسانہ نگار اُن میں شامل نظر آتی ہیں۔ یہ ہمارے لئے اردو افسانہ کے لئے اور افسانہ سے تعلق رکھنے والوں کے لئے فخر اور مسّرت کی بات ہے۔

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی کا تعلق ریاستی شعبہ تعلیم سے ہے۔ وہ نہ صرف کالج سطح پر فارسی پڑھاتی ہیں بلکہ ریاست جموں کشمیر میں ادبیات کے اساتذہ اور اسکالروں میں اپنا ایک معتبر مقام رکھتی ہیں۔ وہ اردو اور کشمیری زبان میں قلمبند کئے چند چیدہ چیدہ افسانوں کو فارسی کا روپ دے کر ریاست کے ادبی حلقہ کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔ گذشتہ چند برسوں سے وہ خود بھی اردو میں افسانے لکھ رہی ہیں اور خوب لکھ رہی ہیں۔ ان کے افسانے ریاست اور بیرونِ ریاست سے شائع ہونے والے معیاری جرائد میں شائع بھی ہونے لگے ہیں۔ اس طرح سے وہ ریاست سے تعلق رکھنے والی خواتین افسانہ نگاروں کی صف میں نظر آنے لگی ہیں۔

ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ۔۔ چنار کے برفیلے سائے ۔۔ ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانوی مجموعہ کی رسم رونمائی اردو اکادمی جموں کشمیر نے مرحوم عمر مجید کی پانچویں برسی کے موقع پر منعقدہ ایک پُر وقار تقریب میں عمل میں لائی گئی تھی۔ اس بارونق ادبی مجلس کی صدارت پروفیسر محمد زمان آزردہ نے کی جبکہ جسٹس بشیر

احمد کرمانی، غلام نبی خیال اور پروفیسر جاوید قدوس ایوانِ صدارت میں تھے۔اس موقع پر جسٹس کرمانی نے ڈاکٹر نیلوفرنحوی ناز کے افسانوی مجموعے کے تعلق سے فرمایا تھا۔۔ ''ادیب اور شاعر سماج کے آئینہ دار ہوتے ہیں جو زندگی کے نشیب وفراز اور حقیقت کو لوگوں کے سامنے لاتے ہیں۔اردو زبان عظیم تمدنی ورثہ کی امین ہے۔جس کی قدر ہونی چاہئے اور نو جوان پود کو اس زبان کی ترقی کے لئے کام کرنا ہوگا۔افسانوی ادب میں ڈاکٹر نیلوفر ناز کا استقبال کیا جانا چاہئے۔'' اس مجلس میں پروفیسر قدوس جاوید نے یہاں کے افسانہ نگاروں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان کی تخلیقات کا موضوع ہی کشمیر کا درد و کرب ہے اور جن لوگوں کو کشمیر کے درد و کرب کا اندازہ نہیں انہیں کشمیر کے افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مطالعہ کرنا ہوگا تا کہ وہ اس درد وکرب کو محسوس کر سکیں۔یہی درد اور کرب ڈاکٹر نحوی کے افسانوں میں بھی موجود ہے۔'' غلام نبی خیال نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔۔۔ ''ریاست جموں کشمیر میں فکشن کا مستقبل روشن ہے اور ڈاکٹر نحوی کا افسانوی مجموعہ۔۔۔چنار کے برفیلے سائے۔۔۔اسی روشنی کا ایک حصہ ہے!

اور اب ڈاکٹر نیلوفر نحوی ناز کا دوسرا افسانوی مجموعہ۔۔ ''خاموش آسمان''۔۔ منظر عام پر آرہا ہے۔یہ ان کے تیئس (۲۳) افسانوں پر مشتمل ہے۔مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر نحوی کی یہ کہانیاں آج کے انسان کی کہانیاں ہیں، آج کے دور کی کہانیاں ہیں۔یہ بدلتے ہوئے قدروں کی کہانیاں ہیں۔ان میں احتجاج ہے اور محبت کی چاشنی بھی۔یہ کہانیاں پڑھ کر آپ کو ایک عجیب سی کیفیت سے

گذرنا پڑے گا۔کئی جانی انجانی تصویریں نگاہوں کے سامنے جاگ اٹھیں گی۔کئی انسانی خدوخال ابھریں گے اور ڈاکٹر نحوی کی تحریروں میں پوشیدہ ہوجائیں گے لیکن انہیں فراموش کرنا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہوگا۔عام فہم، سلیس اور سادہ زبان کا استعمال ان افسانوں کی ایک اور خوبی ہے۔

نور شاہ

سرینگر

۱۷/فروری ۲۰۱۵ء

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی کے افسانے

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی کا یہ دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔وادی کشمیر کی افسانہ نگار خواتین کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔افسانوی ادب کے ساتھ جنون کی حد تک ان کا لگاؤ اور محبت قابلِ تحسین وستائش اسلئے بھی ہے کہ یہ اپنی لاتعداد گھریلو اور دیگر مصروفیات اور ذمہ داریوں کے باوجود بھی اردو رسائل و جرائد میں اپنی بھر پور صلاحیتوں اور موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہیں اور پھر اپنے افسانوی مجموعے بھی شدومد سے منظرِ عام پر لاتی ہیں۔

ڈاکٹر نیلوفر کے افسانے بھی کافی دنوں سے معیاری رسائل و جرائد کی زینت بنتے آرہے ہیں اور پسند بھی کئے جاتے ہیں۔پچھلے سال اردو افسانے پر بات کرتے ہوئے مشہور نقاد و محقق اور سنٹرل یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر قدوس جاوید نے بجا طور پر فرمایا کہ آج کا اردو افسانہ زندگی کے بہت قریب

الفاظ و اسلوب نے زیادہ متاثر کیا تو کسی نے کم۔

بحثیت مجموعی نیلوفر صاحبہ کے اس دوسرے افسانوی مجموعے میں جو جاندار کہانیاں شامل ہیں امید ہے وہ یہاں کی خواتین فکشن نگاروں میں ان کا جائز مقام و مرتبہ متعین کرنے میں ضرور مددگار ثابت ہونگیں اور ادبی حلقوں میں بھی ان کی خوب پزیرائی کی جائیگی۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

احقر

ڈاکٹر اشرف آثاری

صدرہ بل

۵/ مارچ ۲۰۱۵ء

cell 9419017246

آچکا ہے۔

معاصر افسانہ نگاروں کے افسانے جب ہم اس تناظر میں پڑھتے ہیں تو ہمیں پروفیسر موصوف کے اوپر مذکورہ قول کی حرف بہ حرف تائید کرنی پڑتی ہے کہ آج کا افسانہ ترقی پسندیت اور جدیدیت کے لایعنیت اور تجریدیت سے گذر کر مابعدِ جدیدیت سے ہوتے ہوتے عصرِ حاضر تک آپہنچا ہے جہاں اسے بجا طور پر زندگی کے بہت قریب محسوس کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی کے افسانے ہمارے معاشرے کے مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا لہجہ اور اسلوب نہ علامتی ہے اور نہ مبہم۔ سیدھے سادھے الفاظ، اور سلیس اور آسان زبان میں اپنی بات رکھ لیتی ہیں ان کے افسانے پڑھ کر اور ان افسانوں کے کرداروں کے متعلق جان کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہمارے آس پاس رہنے بسنے والے لوگ ہیں جن کے مسائل و معاملات کو اجاگر کیا جارہا ہے۔

عالمی سطح، یا ملکی سطح پر اردو افسانوی ادب میں کئی نامور اور پر صلاحیت نسوانی آوازیں اس وقت سرگرمِ عمل ہیں۔ خاص طور پر کشمیر میں زنفر کھوکھر، واجدہ تبسم گورکو، ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی وغیرہ۔ ان کے موضوعات اور مسائل لگ بھگ ایک جیسے ہی ہیں وہ اسلئے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کا جو مقام و منصب ہے اس کے پیشِ نظر عورتوں کو اپنی روزمرہ زندگی میں ایک جیسے مسائل سے جوجھنا پڑتا ہے۔ لازمی طور پر یہی مسائل ان کے زیرِ غور بھی آجائینگے۔ یہ ایک صحت مند طرزِ عمل اور طرزِ فکر بھی ہے

کہ آپ اپنے قارئین کو طوطا مینا کے گھسے پٹے قصے اور کہانیاں نہیں سنا رہے ہیں بلکہ آئینہ دکھا رہے ہیں جس میں ان کو اپنا ہی عکس دکھائی دے رہا ہے۔

آج کے ادب کا قاری موجودہ نا مساعد حالات' سیاسی اتھل پتھل اور معاشی عدم استحکام اور دیگر روز بروز ابتر ہونے والے معاملات کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان ہے اسے گنجلک پیچیدہ اور سخت فہم اور خشک علامتی افسانوں میں الجھانے کے بجائے کسی مثبت سوچ کی طرف لیجانا قدرے بہتر اور افضل بھی ہے۔ اسطرح کے افسانوی ادب کے قارئینَ کی تعداد بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔

جدیدیت کے زیرِ اثر تخلیق ہونے والے علامتی افسانوں سے جو تجربہ حاصل ہوا وہ بھی اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی کی کہانیوں کے موضوعات ہمارے معاشرے کے مسائل کے ارد گرد ہی گھومتے ہیں۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے اور اب دوسرے زیرِ تبصرہ مجموعے میں شامل اکثر کیا لگ بھگ ساری کہانیاں ان کے اسی نظریئے کی تائید کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ عصر حاضر کی اردو کہانی کا مزاج بھی یہی ہے اور موجودہ معاشرے کے حالات و واقعات بھی اسی کا تقاضہ کرتے ہیں اور پھر قارئین بھی اس کو پسند کرتے ہیں۔

کشمیر کے موجودہ نا مساعد حالات پر بھی ان کے ہاں افسانے لکھے گئے ہیں۔ یہاں کا کوئی افسانہ نویس ایسا نہیں ہے جس نے ان حالات پر اپنے منفرد و مخصوص فکر و سوچ کے مطابق لکھا ہے۔ اور لکھ بھی رہے ہیں۔ کسی کے فکر و فلسفے اور

۱

مِش ٹیک

(mishtake)

تینوں ماں بیٹے اس بات سے تنگ آ چکے تھے کہ وہ بوڑھا کھوسٹ ان کی جان کھائے۔دن میں ہزار بار وہ بہو کو بلاتا تھا اور کبھی چائے ،کبھی پانی ،کبھی سیب ،کبھی ،سنترہ ،کبھی لسی ،کبھی یہ تو کبھی وہ، ہر دوسرے لمحے وہ کبھی بہو کو بلاتا تھا اور کبھی اسکے بچوں کو۔جب تک اس کا بیٹا نوکری سے واپس نہیں آتا تھا ان سب کا کلیجہ مُنہ کو آتا تھا۔مگر کوئی کرے تو کیا کرے۔

اس کا بیٹا منیر شام گئے اپنے ابو جی کے پاس بیٹھتا ۔اس کی خدمت کرتا۔اسکے ساتھ محو گفتگو ہوتا۔کبھی بے تکی باتوں پر ہنستا ،کبھی قہقہہ لگاتا ،اور اپنے ابو جی کے ساتھ طرح طرح کی باتیں کرتا۔حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کو دوسرے ہی لمحے

یہ سب گفتگو بھولنے والی ہے مگر اس کے باوجود بھی وہ ڈھیر ساری باتیں کرتا، اور اس کا دل بہلاتا۔ وہ اپنے ابوجی کے ساتھ ہی اسی کے کمرے میں دوسرے بیڈ پر سوتا تھا۔ اور وہ بڑے دنوں سے ادھر ہی سوتا تھا کہتا تھا۔

''ابھی ابوجی کی صحت ٹھیک نہیں ہیں۔ جب صحت یاب ہو جائیں گے تب اپنے کمرے میں واپس جاؤں گا۔''

اور ابوجی کو بھی اب ان کی عادت ہو چکی تھی۔ شاید اسی لئے سارا دن بیٹے کا انتظار کرتے کرتے اپنی بہو کو کسی نہ کسی طرح اپنے قریب بلاتا تھا تا کہ دن نکل جائے۔

ماں بیٹے چوری چھپے گفتگو میں مشغول تھے۔

''مما مجھے لگتا ہے کہ ہمیں دادو کو۔۔۔۔۔۔ (ہاتھوں سے گلے پر اسطرح اشارہ کیا جیسے ہاتھ میں چھرا ہو۔)

کیا کرنا چاہئے؟ تمہارا مطلب ہے۔۔۔۔''

کچھ مطلب نہیں چھوٹے، تو چپ رہ، بات مت کر۔

''مما میں بات کیوں نہ کروں۔ میں بھی تو دادو سے تنگ آ گیا ہوں۔''

اس نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا تا کہ اس کی آواز باہر نہ جائے۔

جب سے ابوجی کے پاس ان کا ڈیڈی سوتا تھا تب سے دونوں بچوں نے اپنا ڈھیرہ ماں کے کمرے میں ہی جمایا تھا۔ مگر پھر بھی اس بات سے کُڑتے تھے کہ ان کا باپ ان کی ماں سے دور رہے۔

دوسرے دن شام کو جب دونوں بچے واپس آئے تو بڑے بیٹے کے چہرے

پر عجیب رونق تھی۔ وہ ماں کو جلدی سے دوسرے کمرے میں لے گیا اور اسکے کان میں کچھ کہنے لگا۔

ماں کی جیسے لاٹری لگ گئی۔ زمین سے اُچھل پڑی۔

''انجکشن؟ انجکشن کہاں سے لایا؟ ماں نے دھیرے سے آواز کے بغیر کہہ دیا۔

''ماں سوال مت کرو۔۔۔ جس نے دیا اس نے کہا ایک ہی کافی ہے'' بیٹے نے بھی دھیمی آواز میں کہا۔

صبح کے وقت جب ماں کی آنکھ کھل گئی تو اس کے چہرے پر ایک غیر اطمینانی کی لکیر تھی۔ ایک بے چینی سی اسے بے چین کئے جارہی تھی۔۔۔۔۔ جیسے اس کا دل اسکے سینے میں سے باہر نکلنے کو کشش کررہا تھا۔۔۔ وہ اپنے آپ پر قابو ہی نہیں پارہی تھی۔۔۔ بے قراری۔۔۔ بے کلی۔۔۔ اضطراب۔۔۔ اسقدر۔۔۔ کیا کرے۔۔۔۔ سکون کیسے آئے گا۔۔۔

''بہو ذرا مجھے چائے کا ایک کپ دینا۔۔۔''

تینوں ماں بیٹے دوڑ پڑے۔ اس آواز نے انہیں چونکا دیا۔ ان سب کی آنکھیں پھٹی رہ گیئں۔

پاپا کے بستر میں دادو سویا ہے اور دادو کے بستر پر ان کا پاپا۔ بیٹے کی چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنے پاپا کے چہرے سے رضائی ہٹائی۔ اسکا پاپا پورا نیلا پڑ چکا تھا۔

☆☆☆

۲

تیسری بیٹی

"اب کے بار اگر تم نے بیٹی کو جنم دیا تو تم گھر کیسے آؤ گی"۔ شوہر کے یہ الفاظ ماریہ کے دل پر نشتر کا کام کر گئے۔ مگر اس نے بھی اپنے شوہر کو تگڑا جواب دیا،

"کیوں میں دیکھ کر آتی ہوں بیٹا ہے یا بیٹی۔ جو اللہ تعالیٰ میری جھولی میں ڈال دے گا مجھے منظور ہے۔"

"تجھے منظور ہے مجھے نہیں۔ دو بیٹیاں تو پہلے سے ہیں اب کی بار اگر تیسری بھی بیٹی ہوئی تو میں زہر کھالوں گا۔"

ماریہ کے دل و دماغ پر شوہر کے کہے ہوئے یہ جملے ہتھوڑے مار رہے تھے۔ وہ من ہی من میں یہ جملے دہرا رہی تھی۔ بیٹی، زہر، گھر، تیسری بیٹی؟؟؟

کیسی الجھن میں ڈال دیا تو نے مجھے۔۔۔"

اگر بیٹی ہوئی تو اسمیں میرا کیا قصور ہے۔؟

بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔

"ابھی تو ہماری تیسری بیٹی ہے لوگوں نے تو بیٹے کے انتظار میں سات سات بیٹیوں کو جنم دیا ہے"۔

ماریہ کو ہسپتال لایا گیا مگر اسکے تو بال و پر جیسے ٹوٹ چکے تھے۔نہ دل میں کوئی خوشی نہ آنکھوں میں کوئی چاہت۔اسکی ماں اسکو بار بار خوش رہنے کی تلقین کر رہی تھی۔مگر وہ تھی کہ سمجھانے پر بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔اسکی آنکھوں میں خوف اور دل میں ایک ڈر بیٹھا ہوا تھا۔وہ اپنی ماں کے آگے اپنے اس ظلم کی داستان بیان نہیں کر سکتی تھی جو ظلم اس کا شوہر اس پر کرنے جا رہا تھا۔اسی لئے اس نے خاموشی اختیار کی تھی۔وہ ماں کے سامنے نہ تو رو سکتی تھی اور نہ ہی اسے کوئی شکایت کر سکتی تھی۔اسکی ماں تو سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی کہ یہ اداس کیوں ہے۔

ماریہ دل ہی دل میں اللہ کی بارگاہ سر بہ سجود ہوئی۔

"اے اللہ تو تو بانجھ کو بھی اولاد دے سکتا ہے۔تو مجھے اولاد نرینہ عطا کر۔تیرے خزانوں سے کچھ کمی نہیں ہوگی۔میں بیٹیوں سے ہرگز عاجز نہیں۔مگر میرے گھر کو بچانے کا واحد ذریعہ میرا بیٹا ہے۔یا اللہ تو مجھے ایک بیٹا عطا کر"۔

ماریہ کی شادی کو ابھی صرف تین سال ہوئے تھے۔اور آج اسکے تیسرا بچہ ہونے والا تھا۔اس کے شوہر نعیم کو بیٹے کی بہت زیادہ چاہت تھی۔اور اس سے بھی زیادہ اس کو لوگوں کے طعنوں کی فکر تھی۔اگر بیٹا نہ ہوا تو کیا ہوگا۔اس کو لگ رہا تھا کہ

اگر پھر بیٹی ہوئی تو لوگ سمجھیں گے کہ یہ کیسا مرد ہے۔اس میں بیٹا پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔

جس کمرے میں ماریہ کو رکھا گیا تھا اسی کمرے میں ایک اور لڑکی کو رکھا گیا تھا۔اس کا بھی بچہ ہونے والا تھا۔اور ابھی تک اس نے دو بیٹوں کو جنم دیا تھا۔مگر ایک بھی بچہ اس کا زندہ نہیں تھا۔اسکے سارے گھر والے پریشان تھے کہ اب کی بار جو بچہ ہوگا وہ زندہ ہو۔۔انہیں بچہ چاہئے تھا صرف بچہ۔۔۔۔چاہے وہ لڑکی ہو یا لڑکا۔

ماریہ کو جس کا ڈر تھا وہی ہوا۔تیسری بھی بیٹی ہی ہوئی۔اب کے اس کا دل بیٹھا جانے لگا۔۔۔۔اب کیا ہوگا۔۔۔اب اس کا شوہر اس کو کبھی نہیں لینے آئے گا۔۔۔۔تین تین بیٹیاں ۔۔ان کو لیکر وہ کہاں جائے گی۔۔۔کیا کرے گی۔۔۔

اس نے اپنی بیٹی کو گود میں اٹھایا۔کتنی پیاری ہے ۔اسکی گول گول بڑی بڑی آنکھیں اور اسکے گلابی ہونٹ، وہ اسکو پاگلوں کی طرح چومنے لگی۔

ساتھ والی مریضہ کے یہاں پھر سے ایک مرا ہوا بچہ پیدا ہوا۔اور وہ بھی بیٹا۔صف ماتم بچھ گئی۔وہ سب رو رہے تھے۔اب کے تو ماریہ اور بھی اپنے بچے کو سینے سے لگا کے بیٹھی رہی۔اسکی بڑی بڑی آنکھوں اور اس پر لامبی پلکوں کو دیکھ کر ماں کا دل اور بھی پسیج گیا۔

''میری بیٹی اگر تمہارا باپ تمہیں لینے نہیں آئے گا۔تو میں بھی اسے کبھی اصرار نہیں کروں گی۔۔۔۔میں بھی اب وہاں کبھی نہیں جاؤں گی۔اب کی بار میرا

فیصلہ بھی اٹل ہے کہ اگر وہ مجھے اپنانا چاہے تو بیٹیوں کے ساتھ اپنانا ہوگا۔ میرا سارا جہان تو تم تینوں بیٹیاں ہو۔ میری زندگی اب تم سے ہے۔ میں اُن کے بغیر تو رہ سکتی ہوں مگر تمہارے بغیر نہیں۔ اگر مجھے میرے شوہر اور تم بیٹیوں میں سے ایک کو چننا ہوگا تو میں آپ کو چنوں گی۔ میری بیٹی میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔

اچانک اسکی نظریں اٹھی اور اس نے دروازے پر بچیوں کے دادا اور دادی کو دیکھ لیا۔ اس کا شوہر بھی انکے پیچھے کھڑا تھا۔ ان سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

ہسپتال کے کمرے میں جو صفِ ماتم بچھ گئی تھی اس کا درد ان تک بھی پہونچ گیا تھا۔ کیونکہ جس ماں نے اپنا بچہ کھویا وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ اور خدا سے کہہ رہی تھی۔

''اے اللہ مجھے مردہ بیٹا نہیں چاہئے تھا۔ زندہ بیٹی ہی چاہئے تھی۔ اپنی کھوکھ کا زندہ بچہ۔ اے اللہ تم کو کونسی کمی ہو جاتی اگر تو مجھے ایک بیٹی ہی دے دیتا۔ تو تو لوگوں کو کتنے بیٹے اور بیٹیاں عطا کرتا ہے۔''

اس کی آواز میں ایک درد تھا۔ اس کی آہ وزاریِ نے سب کے دلوں کو درد سے آشنا کرا دیا۔ ہر کوئی اس کے لئے آنسو بہا رہا تھا۔ وہ کہے جا رہی تھی۔ مجھے بچہ دینے سے تمہارے خزانے کم تو نہیں ہوتے۔

ماریہ کا سسرُ اسکو دیکھتے ہی سامنے آیا۔ اس کا دل بھی موم کی طرح پگل چکا تھا اور آنکھیں گیلی تھیں، کہہ اٹھا۔

''بیٹی بہت بہت مبارک ہو۔ زچہ بچہ دونوں سلامت ہیں۔ چلو بیٹی اپنے گھر چلو۔''

ماریہ نے چور نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا جو اپنی آنکھیں نیچے کیئے ہوئے تھا اور جن سے وہ اپنی شرمندگی جتا رہا تھا۔

ماریہ نے ''جی ابا'' کہہ کر اپنے قدم تیز تیز بڑھائے۔اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

سورج اپنی کرنیں بکھیر چکا تھا اور ہر طرف روپہلی اجالا نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

۳

کھوٹا آدمی

مسٹر محمد اسلم سوٹ بوٹ، ٹائی پہن کر، تیار ہو کر نیچے آئے۔ وہ آج کسی کام سے دہلی جا رہے تھے۔ وہ ایک سرکاری ملازم تھے اور اکثر و بیشتر اسکو ایسے کام آتے تھے۔ تین چار دنوں کے بعد ہی واپس گھر آتے تھے۔ آج وہ ہاتھ میں سوٹ کیس بھی لائے تھے۔ کیونکہ آج وہ دس دنوں کے لئے جا رہے تھے۔ اور آج وہ محمد اسلم کے نام سے نہیں بلکہ اے کے ملک کے نام سے جا رہے تھے۔

ائیر پورٹ پر قدم رکھتے ہی اسکی نظریں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ شاید کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ آگے آگے چل کر اس نے دیکھا کہ ایک شخص ہاتھ میں پلیک کارڈ لئے تھا اور اس پر Mr.A.K Malik لکھا ہوا تھا۔ مسٹر محمد اسلم اس شخص کے پاس گئے اور اپنے آپ کو ملک بتا کر اسکے ساتھ ہو لئے۔ ایک لال رنگ کی مرسڈیز گاڑی

ایئرپورٹ کے باہر کھڑی تھی۔ اسمیں دونوں سوار ہوئے اور گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ تھوڑی دیر گاڑی میں سفر کرنے کے بعد یہ منزل مقصود تک پہونچ گئے۔ اس شخص نے ہوٹل کا راستہ دکھا کے کمرے تک اسکے ساتھ گیا اور گڈ لک کہہ کے واپس چلا گیا۔

محمد اسلم ایک بہت ہی عزت دار گھرانے کا عزت دار شخص تھا۔ اسکی بیوی گھریلو عورت تھی۔ حالانکہ وہ پڑھی لکھی، ایم اے ایجوکیشن تھی۔ اسکی ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہوا تھا۔ اسکی بیٹی نے ابھی ابھی بی اے کا امتحان پاس کیا تھا اور ایم اے انٹرنس کی تیاری کر رہی تھی۔ اور محمد اسلم کا بیٹا انجینئرنگ کر رہا تھا۔ اور وہ بھی بنگلور میں۔ اسکی انجینئری کا دوسرا سال چل رہا تھا۔

گھر بھر بڑا خوش تھا۔ اور خوشحال زندگی بسر ہو رہی تھی۔۔ سائرہ اسکی بیوی سارا دن گھر کے کاموں میں لگی ہوتی تھی۔ جسمیں ہی وہ خوش تھی۔ گھر والوں کے لئے اچھے اچھے پکوان پکانا اسکی ہابی تھی۔ نئی نئی ڈیشز کو ایجاد کرنا اس کو اچھا لگتا تھا۔

آج محمد اسلم کی دلی سے واپسی تھی۔ اس وجہ سے سائرہ کچن میں کچھ سپیشل ڈِش بنا رہی تھی۔

ابھی دو دن بھی نہ گذرے تھے کہ محمد اسلم کو پھر فون آیا۔ اور اسکو کہیں اور جانا تھا۔ اسنے سائیرہ سے کہا۔

''سائرہ بیگم مجھے پھر جانا پڑے گا۔ اور اس دفعہ صرف دو دن کے لئے۔''

''آخر روز روز کس لئے جانا پڑتا ہے۔''

''بس ایک دفتری کام ہے۔کوئی نئی پارٹی ہے اسکے ساتھ میٹنگ ہے۔بس دو دن بعد واپسی ہے۔''

دو دن کے بعد آتے ہی اس نے اپنی بیگم سے کہا کہ اسے چند دنوں کے بعد ہی پھر سے جانا ہے۔اسکی بیوی بار بار ان کے جانے سے تنگ ہو چکی تھی ان کی بار وہ بھی تنگ کر بولی۔

''بس جی اب یہ روز روز کا جانا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔کبھی تو جی بھر کر میرے پاس بیٹھا کریں۔''

''چلو بس اس دفعہ جاؤں گا تو پھر میں اگلی بار کے لئے منع کروں گا۔''

اس دفعہ وہ چندی گڈھ جا رہا تھا۔گھر میں اس نے کچھ ایسا ہی کہا تھا۔اب کی بار وہ این اے ٹاک کے نام سے سفر کر رہا تھا۔وہ چندی گڈھ کے بجائے دلی کے ایئر پورٹ پر پہونچ گیا۔اس دفعہ پھر ایک شخص پلیک کارڈ ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔

دلی کے ایئر پورٹ سے ٹیکسی لیکر وہ دونوں جا رہے تھے۔راستے بھر میں کوئی بھی بات نہ ہوئی۔جیسے زبانوں پر تالے لگ چکے تھے۔مگر اسلم صاحب ایسے لگ رہے تھے جیسے کوئی نیا دولھا شادی کے منڈپ کے لئے تیار ہوتا ہے۔ وہ سجا سجایا بلیک سوٹ، بلیک بوٹ، سفید قمیض، لال ٹائی اور جیب میں لال رومال کا ایک کونہ باہر کی طرف نکل رہا تھا۔پچاس سال کا آدمی، پچیس سال کا دولھا لگ رہا تھا۔

تقریباً ڈیڈھ گھنٹہ گذر جانے کے بعد وہ ایک ہوٹل کے نزدیک پہونچے۔جہاں اسکے کمرے کی بکنگ تھی۔وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنی ٹائی اور رومال

کا کونہ سنبھال رہا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے کمرے کے پاس پہونچا۔ کمرہ نمبر ۸۴۰ ۔ ایکدم اسے جھٹکا لگا۔ اور یہ خیال دل میں کوند گیا ڈبل ۴۲۰ ۔۔۔۔ چابی سے کمرہ کھولا اور اندر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوگئی اور وہی آدمی پھر داخل ہوا جو ائیر پورٹ سے اسکو لیکر آیا تھا۔ اسنے اشارے سے دروازے کی طرف دکھایا۔ اور ایک خاتون برقعے میں داخل ہوئی۔ اس نے اسکو بیڈ کے قریب بٹھایا اور خود چلا گیا۔

مسٹر محمد اسلم نے پرفیوم کی ساری شیشی کو تقریباً اپنے اوپر انڈیل دیا۔ اور ٹائی کو سنبھالتے ہوئے خاتون کے قریب آ گیا جو برقعے میں ابھی تک سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے اسکا نقاب سرکانے کی کوشش کرتے ہوئے فلمی گانے کی یہ لائین گا کر دہرائی۔ ''رخ سے ذرا نقاب ہٹا لو۔۔۔۔'' ابھی نقاب رخ سے پورا اترا ابھی نہ تھا کہ چاند کا ٹکڑا آدھا ہی نظر آیا۔۔۔۔

مگر اس نقاب والی کی آنکھیں حیرانگی اور پشیمانی میں کھلی کی کھلی رہ گیئں۔ اس کی چیخ سی نکل گئی۔

''پا۔۔۔۔ پا۔۔ پاپا آپ''۔

☆☆

۴

عذل

اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ رہی تھی۔۔اس کا دماغ جیسے سُن ہوگیا تھا۔ وہ سوچ ہی نہیں پا رہی تھی کہ اسکے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے اور وہ اب کیا کرے گی۔ وہ اپنے آپ کو اس دنیا میں بالکل اکیلی محسوس کر رہی تھی۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی۔

اس کا شوہر ریاض ایک سرکاری ملازم تھا۔ کسی کام سے اپنے شہر سے باہر گیا تھا کہ قدرت نے اس کے ساتھ ایک کھیل کھیلا۔ ایک ایکسیڈنٹ میں اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔

نازنین اور ریاض کی دو پیاری پیاری بیٹیاں تھیں۔ جن سے وہ بہت پیار کرتا تھا۔ ایک پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی اور دوسری ساتویں میں۔

ریاض اب گھر ہی میں بیٹھا تھا۔ آہستہ آہستہ درد نے ایسی صورت اختیار کی، کہ وہ سہارے کے بغیر اٹھ بھی نہیں پاتا تھا۔ یوں آہستہ آہستہ گھر کا سارا بار و بوجھ نازنین پر آپڑا۔

وہ اکیلی بچوں کے سکول دیکھتی، گھر دیکھتی، شوہر کو دیکھتی، شوہر کے ماں باپ کا خیال رکھتی اور اس کے ساتھ ساتھ نوکری بھی کرتی۔ اب تو پیسہ بھی پانی کی طرح بہنے لگا۔ کبھی ٹیسٹ کبھی دوائیاں۔ اور اس کے علاوہ اب شوہر کا دھیان بھی تو زیادہ رکھنا تھا۔ کیونکہ اب اس کو معمولی کام کے لئے بھی کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے اب نوکر بھی رکھنا پڑا۔ جو سارا دن اس کی دیکھ بھال کرتا۔ اسکے علاوہ گھر کے لئے بھی ایک عدد نوکر کی ضرورت تھی۔ جو گھر اور ماں باپ کا خیال رکھتا۔ بچے ابھی چھوٹے تھے۔ اس لئے وہ ابھی کوئی کام کرنے سے قاصر تھے۔

مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ قدرت نے یہ کھیل بہت تیزی کے ساتھ کھیلا۔ اور کچھ ہی مہینوں میں ریاض کو دل کے دورے یکے بعد دیگرے پڑتے گئے۔ اس کی حالت پرائیوں سے دیکھی نہ جاتی تھی تو اپنوں کی کیا بات تھی۔

اور ایکدن جب آسمان پر کالے کالے بادل چھا گئے اور دن میں اندھیرا سا چھا گیا تو نازنین کی زندگی میں بھی کالے بادلوں کا گھیراؤ ہو گیا۔ اسکی زندگی جیسے اندھیروں میں گر گئی۔ اس کی زندگی کا مقصد ہی جیسے ختم ہو گیا۔ اتنی خدمت گذاری، اتنی محنت، اتنی تیمارداری، اتنا خیال رکھنے کے باوجود بھی اس کے شوہر کی زندگی کا سورج ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔

شوہر کو گذرے ہوئے ابھی چند دن ہی ہوئے تھے، ابھی زخم سے خون رِس ہی رہا تھا۔ ابھی درد سے وہ کراہ ہی رہی تھی کہ اس کی ساس نے اس کو کمرہ میں جانے سے منع کر دیا اور اسکا سامان بھی مقفل کر دیا۔ کہا کہ یہ میرے بیٹے کا کمرہ ہے اب کسی کو حق نہیں کہ وہ اس کمرے میں جائے۔ یہاں کی ہر چیز پر صرف اور صرف میرا حق ہے۔ بہو اب اس گھر میں کس کے سہارے رہے گی۔ چاہے تو بہو اب میکے بھی جا سکتی ہے۔

نازنین نے یہ بات سُنی تو اس نے اپنی ساس سے کہا۔

"مگر اماں میں بے سہارا کہاں جاؤں گی۔ اس وقت مجھے آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔"

نازنین روئے جا رہی تھی اور گڑگڑا رہی تھی مگر اس کی ساس آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔

نازنین نے اپنا رخ اپنے سُسر کی طرف کیا اور کہا،

"ابا، آپ ہی کچھ کہیے نا اماں سے۔ میرے بچے تو آپ کا خون ہے ۔ میں ان بچوں کو لیکر کہاں جاؤں گی"

اس کا رونا اور گڑگڑانا دونوں میں سے کسی ایک پر بھی اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔ نازنین پھر ایک بار اپنی ساس کی طرف مڑی اور روئے جا رہی تھی۔ روتے روتے اس نے کہا۔

"اماں میرا قصور کیا ہے۔"؟ ایک طرف سے تو میری قسمت پھوٹ گئی، اور دوسری طرف سے آپ روٹھ گئے۔۔۔ میں کیا کروں۔۔ کہاں جاؤں"۔

اماں نے اپنی زبان کھولی۔ جیسے کہ بہو کو سمجھانے لگی۔

''مگر بیٹا۔۔۔اب یہاں تمہارا کون ہے ۔کس کے سہارے رہوگی۔میرا تو یہی ایک بیٹا تھا اور اس کو تم نے نگل لیا۔اب یہاں کیا ہے۔''

''پر اماں''۔

''پر،ور کچھ نہیں۔۔تم اپنی بیٹیوں کو لیکر باپ کے گھر جاؤ۔اور ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دو۔''

''مگر اماں، میری بیٹیاں تو آپ کا خون ہیں۔آپ کا بیٹا تو ان بیٹیوں سے بہت پیار کرتا تھا۔مجھے ایک بار موقعہ دے دو۔میں آپ لوگوں کی خدمت کروں گی۔''

''نہیں بھئی۔ہمیں اب معاف ہی کردو۔'' نازنین گڑگڑاتی رہی۔مگر اماں وہ جگہ چھوڑ کر اندر چلی گئی۔ابا بھی آہستہ آہستہ اپنے قدم اندر کی طرف اٹھانے لگا۔

عورت چاہے کتنی بھی کمائی ہو، کتنی بھی بڑی افسر ہوا سکے شوہر کی اہمیت اس کی زندگی میں بہت زیادہ ہے۔جس طرح عورت کے بغیر مرد کی زندگی ادھوری ہے اسی طرح عورت کی زندگی بھی مرد کے بغیر خالی ہے۔ان دونوں کی زندگی ایک دوسرے پر منحصر ہے۔

ایک طرف اس مصیبت کو سہنا اور دوسری طرف ۔۔۔دوسری طرف اُس کے ماں باپ نے ان تینوں کو گھر سے نکال دیا۔نازنین اب جائے تو جائے کہاں۔ اس کو کسی چیز کی کمی نہ تھی مگر جس چیز کی کمی ہوگئی وہ رہ گئی۔وہ میکے جانے سے شرماتی تھی۔مگر کیا کرتی۔سر پر چھت بھی تو ہونی چاہیے۔آخر کار دونوں بیٹیوں کو لیکر اپنے

میکے چلی گئی۔ایک طرف شوہر کے جانے کا غم اور دوسری طرف گھر سے نکال دئے جانے کا غم۔وہ تو غموں کے سمندر میں ہی ڈوب گئی۔

اب تو گھر خالی ہو گیا اور تنہا رہ گئے میاں بیوی۔جن کو نہ آگے تھا کوئی اور نہ پیچھے کوئی۔

نازنین کو اپنے میکے والوں نے سنبھالا۔مگر نازنین بہت ہی خود دار قسم کی لڑکی تھی۔وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔وہ اسسے اپنی قسمت سمجھ رہی تھی جو کچھ اس کے ساتھ ہو گیا۔اور سچ بھی تو وہی تھا۔اللہ تعالیٰ نے اس کی ہاتھوں کی لکیروں میں یہی کچھ لکھا تھا۔جس کو اس نے قبول کر لیا۔اور اگر قبول بھی نہ کرتی تو کیا کرتی۔

نازنیں کی آنکھوں سے آنسو اتر گئے۔''ابا آپ لوگ بھی نہ ہوتے تو میرا کیا ہوتا۔میں بے سہارا تو مر ہی جاتی۔''

''ایسا نہیں کہتے بیٹا'' ابّا کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

''رات کی تاریکی اور اندھیرا جتنا بھی بڑھ جائے۔صبح کا سورج اجالا اور روشنی ہی لیکر آتا ہے۔اور مجھے بھی یہی یقین ہے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو''

سننے میں آیا کہ اسکے ساس اور سُسر کا کار ایکسیڈنٹ ہو گیا۔نازنین بے چین ہو گئی۔ابھی تو اس کے شوہر کو گذرے ہوئے چھ مہینے بھی نہیں ہوئے تھے۔پھر اس کے ماں باپ۔۔۔نہیں۔۔نہیں

۔۔اے اللہ ایسا غضب نہ کرنا۔

انہوں نے میرے ساتھ جو بھی کیا۔۔۔

ہیں تو وہ میرے بچوں کے دادا۔دادی۔۔۔

نازنین سوچ رہی تھی کہ وہ اپنے ساس سسر کو دیکھنے جائے گی۔اور ان کا حال پوچھے گی۔مگر اسکی جرائت ہی نہیں بن پا رہی تھی۔اس نے دل میں سوچا۔

''کہیں انہوں نے پھر سے گھر سے نکال دیا تو کیا کروں؟؟

دوسرے دن نازنین کے آنگن میں وہ دونوں کھڑے تھے۔نازنین سے اپنے کیئے پر معافی مانگ رہے تھے۔اور اپنے کیئے پر شرمندہ تھے۔

''بیٹی ہمیں معاف کر دو۔اور اپنے گھر چلو۔بیٹیوں کے بغیر ہمارا گھر سونا ہو گیا ہے۔''

☆☆☆

۵

بکریاں

رات نے اپنا کالا اور بھیانک سایہ ہر طرف پھیلا دیا تھا۔ایک تو اندھیرا اور دوسری طرف شدید سردی۔ دو آدمیوں کے سائے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ایک چوراہے پر پہونچ کر وہ دونوں رُک گئے۔اور ادھر ادھر دیکھا۔پھر کچھ سوچ کر دائیں جانب مڑ گئے اور ایک جگہ آ کر رُک گئے۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ دونوں کسی کا انتظار کر رہے تھے۔انہوں نے لامبے چوغے پہن رکھے تھے۔اور اپنے دونوں دونوں ہاتھ ان کے اندر رکھے تھے۔لگ رہا تھا کہ انہوں نے ہاتھوں میں کوئی چیز اٹھا رکھی ہے۔

کچھ دیر بعد دو جوان لڑکے ادھر آئے۔ان کے چہرے کالے رومال سے بندھے ہوئے تھے۔مگر ان کے پورے جسم میں لرزلرز ہورہا تھا۔انہوں نے ہاتھ باہر نکالے اور ان دو آدمیوں سے کسی چیز کی ادلا بدلی کی۔

ان میں سے ایک نے سرگوشی کی۔

''سنو کل مجھے دو چار لاشیں چاہیئے۔اور ہر لاش کی قیمت تمہیں مل جائے گی۔لاش کی عمر جتنی کم ہوگی قیمت اتنی زیادہ۔۔۔۔''

''وہ کیوں۔۔۔۔''

تم کیوں پوچھنے کے حقدار نہیں۔تم سے جتنا کہا جائے اتنا کرو۔۔۔سوال جواب تم نہیں کر سکتے۔۔۔۔آدھی قیمت ابھی اور آدھی کام ہونے کے بعد۔۔۔سمجھ لو میرے پاس انسان کی قیمت موت کے بعد ہے۔۔۔سمجھے؟۔۔۔''

رات کے اندھیرے میں بات ہوئی اور دونوں لڑکے اپنے راستے چلے گئے۔اور وہ دونوں آدمی اسی راستے انکے پیچھے ہو لئے۔

رات کا سناٹا بڑھ رہا تھا۔بڑے بڑے جوتوں کی آوازیں سڑکوں پر آ رہی تھیں۔ایسا لگ رہا تھا کہ گشتی پارٹی گشت کر رہی تھی۔ایک سڑک سے آئی اور دوسری طرف سے چلی گئی۔یہاں۔۔۔وہاں۔۔۔۔ادھر۔۔ادھر۔۔گشت پہ گشت۔۔

سورج رات کے سناٹے کے بعد درختوں کے پیچھے سے نکل کر سارے عالم میں کرنیں بکھیر رہا تھا۔بلبلیں اپنے گھونسلوں سے نکل نکل کر اپنے بچوں کے لئے دانہ کی جمع آوری میں مشغول ہو گئیں۔کبوتروں نے تاروں کے اوپر دانے کے انتظار میں ایک قطار سی بنائی تھی تھے۔چھوٹے چھوٹے بچے اپنے اپنے سکولوں کے لئے تیار ہونے لگے۔

بچوں کو کتنی دیر کی سردیوں کی تعطیل کے بعد سکول جانا تھا۔ایک نئی خوشی،ایک نیا ولولہ اور ایک نیا جوش انہیں محسوس ہو رہا تھا۔

زندگی کا نظام سورج کی روشنی کے ساتھ ہی جیسے شروع ہو گیا تھا۔ یکا یک دن کی روشنی میں جیسے بادلوں نے گھیراؤ ڈال دیا۔ پورے ماحول میں اندھیرے نے قبضہ کر کے سیاہی پھیلا دی۔

ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر خبر آئی

''شہر کے بیچوں بیچ بم پھٹا اور دو لوگ مارے گئے۔ اور کئی زخمی تھے۔''

''صرف دو لوگ؟

''سودا تو چار کا تھا۔؟

''دیکھتے جائیے۔ چار نہیں کل تعداد پانچ تک بھی پہونچ سکتی ہے۔''

تمام لوگ سڑکوں پر آ گئے۔ ان دو شہیدوں کو خراج عقیدت دینے کے لئے اور ان کے جنازے میں شریک ہونے کے لئے۔

اسی دوران کسی نے پتھر پھینکا، اور کسی کے سر میں لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہُو کا عالم ہو گیا۔ جنازے کسی کو یاد نہیں رہے۔ ایک دوسرے کے سر پتھروں سے پھوڑنے لگے، کہیں سے گولی چلی کہیں سے بم پھٹا اور لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ہر طرف افرا تفری تھی۔ لوگ جنازہ پڑھے بغیر اب گھروں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ موت نے ہر طرف ایک دہشت پھیلا دی تھی۔ لوگ بھاگم بھاگی میں ایک دوسرے کے اوپر چڑھ رہے تھے۔

''سر۔ آج چار لاشیں ہو گئیں۔۔۔۔''

''بے وقوف لاشیں مت کہو، فون ہے۔ بکریاں کہو۔۔۔''

’’جی سر چار بکریاں۔۔۔میرا انعام۔۔۔‘‘

’’تمہیں انعام مل جائے گا۔۔۔ بلکہ تمہارے گھر پہونچا دیا جائے گا۔‘‘

بکریوں کا سودا کر کے دونوں دھڑیں (فریقین) آرام وچین سے بیٹھ گئے۔ بلکہ واویلا کرنے میں آگے آگے آگئے۔۔ ہر چندان کاروباریوں کو ڈھونڈا گیا کہیں کسی کے نشان تک نہ پائے گئے۔گھروں میں ماتم چھا گیا۔لوگ سڑکوں پر نعرے بازی کرنے لگے۔

لاکھوں اور کروڑوں کا کاروبار کرنے والے اپنے لاکھوں اور کروڑوں سمیٹتے گئے اور۔۔۔

۔ایک مہینہ بعد۔۔۔۔۔۔

’’ ہیلو ‘‘

’’آج کے لئے پھر۔۔۔دو بکریاں۔۔۔‘‘

’’قیمت پہلے سے دوگنی۔۔۔مگر شرط۔۔‘‘

’’کیسی شرط۔۔۔‘‘

’’اب کی بار سکولی بچے۔۔۔‘‘

’’ہوں ۔۔۔۔(اس نے اپنے ہونٹوں کو ایک گول کی شکل میں تبدیل کیا۔) اور کہا ’’اعتماد رکھئے سر ہو جائے گا۔۔۔۔ بلکہ ہو ہی گیا سمجھو۔۔۔۔۔

☆☆☆

۶

گم شدہ لمحے

وہ بڑی دیر سے مجھے کوئی کہانی سنانے کی کوشش کر رہا تھا۔اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔جیسے مجھے وہ کہانی کوئی بے جوڑ لکڑی کا سامان لگ رہی تھی جس کو جوڑنے کا کوئی سامان نہیں تھا۔

وہ مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے لے گیا۔اور جیلر۔۔جیسے اسکی جیبوں سے ایک ایک چیز تلاش رہا تھا۔ ہر داشت نداشت ان سے چھین چھین کر لے رہا تھا۔ اسکی جیب میں پڑا بٹوہ اور اس میں پڑے پیسے سب لے گیا۔میرے پاس گولڈن رنگ کا ایک لائٹر تھا جو مجھے میرے چاچا نے دیا تھا۔وہ بھی لے گیا۔

اور ساتھ ہی ساتھ وہ اسکو ''حرام زادہ جیلر'' حرام زادہ جیلر'' کہتا رہا۔

دراصل یہ شخص میرا چاچا تھا اور میں امریکہ پڑھنے کے لئے چلی گئی تھی۔جب میں واپس آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ چاچا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔اسی لئے میں آج ان کو

دیکھنے آئی تھی۔

وہ مجھے بیٹی نہیں بلکہ کوئی ملاقاتی سمجھ رہا تھا۔ جو جیل میں اُس سے ملنے آئی ہوں۔ اور وہ مجھے مزے مزے سے جیل کی کہانیاں سنانے لگا۔ دیکھنے میں بالکل اچھے اور صحت مند لگ رہے تھے۔ مگر جب ان سے بات کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان باتوں کا کوئی آپس میں میل اور جوڑ نہیں ہے۔

پل بھر میں مجھے ایک مکان بلکہ حویلی میں لے گیا۔ جو اسکے باپ دادا کی جائیداد تھی۔ جیل جانے کے بعد وہ جائیداد جیسے اسکے کسی بھائی نے ہڑپ کرلی تھی۔ اور بیچ کھائی تھی۔ وہ جس مکان میں آج رہ رہا تھا وہ اسکا اپنا گھر نہیں بلکہ کسی نے اس کو رہنے کے لئے دیا تھا۔ اور اس گھر کی در و دیواریں، اسکے دروازے، اسکے بام ولب، سب اسکی جیل کی دیواروں سے میل کھاتے ہیں۔

میں حیران و پریشان ہوگئی کیونکہ میں اس شخص کو پچھلے پچیس سالوں سے جانتی ہوں۔ اور میری دانست میں کبھی بھی اس شخص نے جیل کی ہوا بھی کھائی ہے۔

میں اسی سوچ میں تھی کہ جیل کی داستان یہ شخص مجھے کیسے سنا رہا ہے جیسے اس نے برسوں جیل میں گذارے ہیں۔

جیل کے سفر کے ساتھ ہی یہ شخص مجھے کالج کی حسین اور خوبصورت وادی میں لے گیا۔ جہاں ان گنت لڑکے اپنے سکولوں کے بعد کالج کی زندگی کی خوشحالی کو محسوس کر رہے تھے۔ یہ کالج نہ صرف سائنس مضامین پڑھاتے تھے بلکہ یہاں آرٹس کے مضامین بھی پڑھاتے تھے۔ اسی کے بعد کالج کی ہی ایک اور وادی میں جہاں یہ شخص

طالب علم نہیں بلکہ ایک پروفیسر تھا۔ اور یہی اسکی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ وہ کالج کا پروفیسر بنے۔ میری حیرانگی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے مجھے اردو اور فارسی کے کتنے ہی خوبصورت اور دلکش اشعار سنائے جو میں نے کبھی سنے بھی نہیں تھے۔ مجھے ان اشعار کو سُن کر کتنا اچھا لگا تھا۔ میں نے بھی ان سے پوچھ لیا۔

''چاچا یہ شعر آپ نے کب پڑھے اور کب یاد کیئے۔ کالج کے زمانے کے ہیں یا۔۔۔''

''میں ابھی ابھی تو کالج سے واپس آیا ہو۔ میں وہاں فارسی مضمون ہی پڑھاتا ہوں۔ میں ابھی لباس تبدیل کر کے نیچے آیا ہوں۔''

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے ہی والا تھا کہ کب کی بات ہو رہی ہے؟ یہ چاچا مجھے کیا کہتا ہے کہ ابھی کالج سے آ گیا؟ جب سے میں بھی پیدا ہوئی ہوں تب سے یہ ریٹائرڈ زندگی گذار رہے ہیں۔ یہ چاچا کیا کہہ رہے ہیں۔

اتنے میں اسکی بہو اور بیٹی آ گئی۔ میں نے جھٹ ان سے پوچھ لیا۔

''بھابھی۔ چاچا جی کیا کبھی جیل گئے ہیں۔ یہ تو بار بار جیل اور جیلر کا ذکر کرتے ہیں۔''

''جی ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔'' بھابھی نے مذاقاً کہا۔ کیونکہ ناظمہ امریکہ law پڑھنے گئی تھی۔ اپنے چاچا کی صحت میں دلچسپی دکھانے کے لئے بھابھی نے اسے ڈاکٹر صاحبہ کہا۔

''اصل میں بات یہ ہے کہ تمہارے چاچا پچاس سال پیچھے زندگی میں چلے گئے ہیں۔ پچاس سال پہلے جو کچھ انہوں نے کیا تھا ان کو وہ سب یاد ہے۔ اور بیچ کے

پچاس سالوں میں کیا ہوا۔اُس سب کی انہیں کچھ خبر نہیں۔
وہ اپنے زمانے کے ایک بہت اچھے پروفیسر رہے ہیں۔اور کالج میں
پڑھاتے تھے۔پھراس زمانے میں politics میں بھی اپنے پاؤں جمالئے۔ایک
الٹا ہاتھ پڑا اور جیل کی ہوا کے ساتھ ساتھ جیل کی روٹیاں بھی توڑنی پڑی۔جیلر کا
ظلم،جیل کی یادیں،کالج کا زمانہ،پڑھائی لکھائی،پروفیسری وہی سب آج بھی یاد
ہے۔مگر شادی، بچے،بھائی بہن ، بیٹے بہوئیں،کوئی بھی یاد نہیں۔کس کی شادی،کس
کے بچے،،کون بیٹا،کون بیٹی، کچھ بھی یاد نہیں۔ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ ان کی زندگی کی
کتاب کے کچھ حصے جیسے گم ہو گئے ہیں اور ہم سب کا وجود انہی چند ورقوں میں تھا۔مگر
وہ ورقے نہیں تو ہم سب بھی نہیں۔

۷

سکوت

موسم بہت ہی خوشگوار تھا ہوا میں ذرا سی خنکی محسوس ہو رہی تھی مگر اب یہ خنکی اچھی لگ رہی تھی کیونکہ گرمی نے بہت ستایا تھا۔ اب ہلکی ہلکی ٹھنڈ اچھی لگ رہی تھی۔

نبیل اور بابرہ ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈال کر خراماں خراماں چل رہے تھے ان کو ہواؤں کی دخل اندازی خوب لگ رہی تھی۔ کبھی ہوائیں ان کے بالوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ کبھی بابرہ کا ڈوپٹہ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ کبھی نبیل کی قمیض ہوا سے اڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

چلتے چلتے وہ ایک بزرگ چنار کے پاس پہونچے۔ چنار کے سائے میں بیٹھنا ان دونوں کو اچھا لگتا تھا۔ چنار سے اس موسم میں سنہرے پتے گرنے

لگے تھے۔اور ایک ایک کر کے پتوں کا انبار جمع ہو چکا تھا۔ان پتوں پر قدم پڑتے ہی ان کی کرپ کرپ کی آواز آنے لگتی تھی۔جو نبیل کو بہت زیادہ اچھی لگتی تھی۔وہ ان سنہرے پتوں کا متوالا تھا۔

اس نے بابرہ سے کہا۔

"مجھے ان پتوں کی آواز اتنی سہانی لگتی ہے کی کچھ کہنے کی بات نہیں۔"

"مجھے بھی یہ چنار، یہ پتے بہت خوبصورت لگتے ہیں، آؤ انہی کے پاس بیٹھیں"

دونوں چلتے چلتے چنار کے قریب پہونچ گئے۔دونوں نے ایک جگہ چُن لی اور ان کرارے کرارے پتوں کے اوپر ہی بیٹھ گئے۔

نبیل نے ایک پتے کو اپنے ہاتھ میں اٹھایا اور اس کے ساتھ کھیلنے لگا۔اور بابرہ اسکی ان حرکات پر مسکرا رہی تھی۔پھر بابرہ نے بھی کچھ پتوں کو ہاتھ میں اٹھایا اور ان کے ساتھ کھیلنے لگی۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت سالوں سے محبت کرتے تھے۔اور ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔اور گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے۔

چنار سے پتے بھی ایکا دوکا گر رہے تھے۔بابرہ نے نبیل سے کہا۔"نبیل مجھے یہاں بیٹھ کر اتنا اچھا لگا کہ کیا بتاؤں۔چلو اسکے تنے کے ساتھ بیٹھیں گے۔

دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے اٹھے اور چنار کے موٹے تنے کے ساتھ پیچھے سے ٹیک لگائی۔تنے کا اندرونی حصہ کھوکھلا تھا۔ان دونوں نے کھوکھلے حصے کی طرف نظر ڈالی جسکے اندر بھی زرد پتوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ایک دوسرے سے نظریں

ٹکرائیں اور دونوں مسکرا پڑے۔

پھر بہت ہی اطمینان سے ایک دوسرے کے پاس بیٹھ گئے۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے نبیل نے بابرہ سے پوچھا۔

''کیا تم نے گھر والوں کو میرے بارے میں بتایا۔''

نہیں نبیل میں ان کے ساتھ بات نہیں کر سکتی ہوں۔ اور نہ میں تمہارے بغیر رہ سکتی ہوں۔ میری دنیا تو تم سے ہے۔ تم ہو تو جہاں ہے۔ تم نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ شادی کے لئے تمہیں ہی کچھ کرنا ہوگا۔ تم اپنی ممی کو میرے گھر بھیج دو۔ اب ہمیں شادی کر لینی چاہئے۔ اب بہت ہو گیا۔''

''ہاں بالکل۔ آج میں ممی سے بات کروں گا کہ وہ آپ کے گھر پیغام بھیج دیں۔ بس آپ اب تیار رہیے دلہن بن کر میرے گھر آنے کے لئے۔۔۔۔۔۔

''نبیل۔۔۔۔ نبیل۔۔۔۔ اب تم سے دور رہا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ میرا دل کرتا ہے کہ زندگی بھر تمہاری بانہوں میں گذار دوں۔۔۔۔۔۔'' وہ نبیل کے اور بھی قریب آ گئی۔ اور اور بھی زیادہ جذباتی ہو گئی۔

''اب گھبرا کیوں رہی ہو۔۔۔۔ بس اب چند دنوں کی بات ہے۔ اب ہمیں کوئی بھی الگ نہیں کر سکتا ہے۔۔۔ اب ہم زندگی بھر ساتھ رہیں گے۔۔۔ انشااللہ''

نبیل کے کاندھے پر بابرہ کا سر تھا اور بابرہ کے سر پر نبیل کا سر۔ ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے۔ پیار کے دیوانے۔۔۔ پیار کی مستی میں۔۔۔ محبت کا سرور۔۔۔ دلوں کی جلن۔۔۔ عشق کی تپش۔۔۔ آنکھوں کی حرارت۔۔۔۔ جیسے سب ایک

ساتھ سمٹ کر آیا تھا۔۔۔

دور سے موٹے موٹے جوتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔اور آوازیں ان کے نزدیک آکر رُک گیئں۔یہ دونوں پیار کے متانے جیسے نیند سے جاگ گئے۔کئی لوگ وردی پہنے ہاتھوں میں گن لئے دوڑے آرہے تھے۔

''کہاں گئے سالے۔۔۔اسی طرف تو بھاگ رہے تھے۔۔۔؟''

کچھ وردی والے کچھ لوگوں کی تلاش میں اس طرف آئے۔انہوں نے ان پر شاید گولیاں برسائیں تھیں۔اوران کو دیکھ کر ہی جلا کر چلائے۔

''بھوں ڈالوان سالوں کو۔۔۔پیڑ کے سائے میں بیٹھ کر عشق فرمارہے ہیں۔۔۔بھون ڈالو۔۔۔''

ایک پورا برسٹ نبیل کے سینے میں پیوست ہوگیا اور ایک اور بابرہ کے سینے میں۔۔کسی کو ایک بات بھی کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔۔۔۔اور۔۔۔۔عشق خاموش ہوگیا۔

چنارا پنے زرد اور سنہرے پتے برسارہا تھا۔

☆☆☆

۸

پالکی

ابو بستر میں پڑے گہری نیند سو رہے تھے۔خراٹوں کی آوازیں زورزور سے آرہی تھیں۔اور میں نے بھی انکے ساتھ ہی اپنا بستر لگایا تھا۔اور میں بھی سونے کی کوشش کر رہی تھی۔جو بار بار ناکام ہو رہی تھی۔۔ابو ایک دم سے بستر سے اٹھے اور بیٹھ گئے۔اور مجھ سے کہنے لگے۔

''مجھے بہت دیر ہو گئی۔مجھے گھر جانے کی جلدی ہے۔''

گھر؟ آپ تو اپنے گھر میں ہیں۔''

ہاں یہ بھی میرا گھر ہے مگر میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔

میں حیران و پریشان ابو کس گھر کی بات کر رہے ہیں۔اور کہاں کی بات کر رہے ہیں۔جب سے میں پیدا ہوئی ہوں تب سے اسی گھر میں رہتے تھے۔میں نے دوبارہ

پوچھا۔

ابو آپ کس گھر کی بات کر رہے ہیں۔ ہمارا گھر تو یہی ہے۔

اپنا منِ گام، میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔ وہاں سب میرا انتظار کرتے ہونگے۔

میں نے منِگام کا نام تو بہت سُنا تھا کہ ابو وہاں رہتے تھے۔ مگر آج سے پچاس سال پہلے۔ انہوں نے وہ گاؤں کا مکان اور زمین بیچ کر شہر میں ایک بڑا سا محل خریدا تھا۔ اور سالہا سال سے اسی گھر میں رہتے تھے۔ آج اچانک ابو کو وہ منِگام کا مکان یاد آیا۔ ادھر ادھر کی باتوں سے میں نے ان کا دل بہلایا اور یہاں تک کہ نیند نے انکو اپنی آغوش میں لے لیا۔ مگر نیند َ نے میری طرف گذر بھی نہیں کیا۔ میں ساری رات سوچ رہی تھی کہ اچانک ابو یہ کس خیال میں ڈوبے یا انہوں نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا۔

اگلے روز ابو کچھ بدلے بدلے سے نظر آ رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ گھر کے کسی بھی فرد کو یہ صیح طریقے سے پہچان نہیں پار ہے تھے۔ بیٹے، بہوئیں، پوتے، پوتیاں کسی کو بھی تو وہ صیح نام ے نہیں پکارتے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے کہا۔

''سلمیٰ۔ میری ماں میرا انتظار کر رہی ہوگی مجھے گھر لے جاؤ۔''

میں خوشی سے پاگل ہوگئی۔ ان کو خدا کا شکر میرا نام تو یاد ہے۔ میرا نام سلیمہ ہے۔ اور انہوں نے مجھے اکثر سلمیٰ کے نام سے ہی پکارا ہے۔

ابو کی عمر اسوقت ۸۵ برس تھی۔ اور ان کی ماں کو گذرے ہوئے پچاس سے بھی اوپر سال ہو چکے تھے۔ میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا ہے کیونکہ میری دادی میرے پیدا

ہونے سے پہلے خدا کو پیاری ہوگئی تھی۔اور گھر میں اکثر ابو کے منہ سے ان کا ذکر خیر سُنا تھا۔اور ابو ہمیشہ ان کو مغفرت بھیجتے تھے۔

جب سے ''گھر، گھر، کی'' رٹ شروع ہوگئی۔ہم بھی کبھی سچ اور کبھی جھوٹ کہہ کر ان کو بہلاتے تھے۔ابو کے والد صاحب انکی والدہ سے بھی پہلے گذر چکے تھے۔مگر جب بھی ابو اپنے والد کو یاد کرتے تھے تو کہتے تھے۔

''میرے ابا جی بیمار ہیں۔اور میں یہاں دور بیٹھا ہوں۔خدا کے لئے کوئی مجھے ان کے پاس لے جاؤ۔۔مجھے اپنے ابا جی کی بہت یاد آتی ہے۔''

''سلی، راجہ، چھوٹو، کوئی تو مجھے میرے ماں باپ کے پاس لے جاؤ۔وہ میرا انتظار کر رہے ہونگے۔میری ماں میری راہ دیکھتی ہوگی''۔کبھی کبھی اپنے بچوں کو بچپن کے ناموں سے پکارنے لگتا تھا۔

وہ میرے بغیر کیا کرتے ہونگے ؟۔ابو کی آنکھوں میں آنسو آتے تھے۔اور وہ کسی بچے کی طرح کبھی کبھی روتے بھی تھے۔

ہمارے پاس کسی سوال کو کوئی جواب نہیں تھا۔جو جواب بن پڑتا تھا وہی جواب دیتے تھے۔جب یہ حالت ان پر طاری ہوتی تھی اسوقت یہ انہی کو یاد کرتے تھے جو مردہ تھے۔میری حیرانگی صرف اس بات پر تھی کہ خود اسکی بیوی یعنی میری ماں جس کو گذرے ہوئے بھی دس سال ہو چکے تھے اس کا نام انہوں نے کبھی نہیں لیا۔اور نہ ہی اسکے بارے میں کبھی کوئی بات کی۔

مجھے دل ہی دل میں یہ ملال ہوا تھا کہ کیا یہی ان کی محبت اور چاہت تھی

میری ماں کے تئیں۔ اپنے ماں باپ کی تو سارا دن تسبیح کرتے ہیں اور میری ماں کا ذکر تک نہیں۔ جس نے اپنی ساری زندگی اس شخص کے نام کردی تھی۔ جس نے کبھی اپنے میکے تک کا نام بھی نہیں لیا تھا۔ مانا کہ یہ دماغی صحت کی نادرستی کی علامت ہے مگر تب بھی۔۔۔۔

میرے بھائی کو گذرے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا۔ وہ دن رات اسی کے ساتھ رہتا تھا۔ اسکو کھلاتا پلاتا اسکے ساتھ باتیں کرتا تھا۔ مگر اچانک اسکی طبیعت خراب ہوگئی اور وہ بھری جوانی میں اللہ کو پیارا ہوگیا۔ اسکی موت نے ہمارے خانوادہ کو جیتے جی موت دے دی۔ مگر اس کا نام تک بھی نہ لینا میرے لئے کسی کوفت سے کم نہیں تھی۔

ایک رات سب سوئے تھے کہ اچانک اسنے راجہ راجہ کہنا شروع کیا۔ راجہ کہاں ہے۔ راجہ مجھے اٹھاؤ اور گھر لے جاؤ۔

"سلی تمہاری ماں کہاں ہے"۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ مگر کچھ جواب بن نہ پڑا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ کہ آج ابو کو اپنی بیوی اور اپنے بیٹے کی یاد آئی۔

"ذرا اپنی ماں کو بلاؤ۔ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ میں نے ہمت کر کے جواب دیا۔

"ابا۔ ماں بھی مِن گاؤں گئی ہے۔ آپ کے ماں باپ کے پاس۔

"کب؟

"بہت دنوں پہلے"

اچھا راجہ کہاں ہے“

راجہ کو بھی ماں اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ وہ سب گاؤں گئے ہیں۔ جب آئینگے تو سب اکھٹے آئیں گے۔ زیرلب میں نے کہا۔ وہ اس گاؤں گئے ہیں جس گاؤں سے کوئی بھی واپس نہیں آتا ہے۔ میرے ان جملوں کے ساتھ ہی جیسے ان کو تسلی ہوگئی اور وہ سو گیا۔ صبح کی اذان ہونے لگی تو ابا کی نیند کھل گئی۔ اشھد ان لا الہ اللہ، اشھد ان لا الہ اللہ، اشھدان محمدؐ رسول اللہ، ، اشھدان محمدؐ رسول اللہ۔ موذن کی آواز کے ساتھ ساتھ ابا بھی ازان پڑھ رہے تھے۔ اچانک سے ابا کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

”دیکھو میرے گھر والے میرے لئے پالکی لے کر آئے ہیں۔ ان چاروں نے پالکی کو چار اطراف سے پکڑا ہے۔ وہ مجھے گھر لے جانے کے لئے آئے ہیں۔ دیکھو اب میں بھی منِ گام جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔۔۔ خدا حافظ“

دیکھتے دیکھتے ابو کی گردن ایک ہی طرف سے اٹک گئی اور ہم سب دیکھتے ہی رہ گئے۔

☆☆☆

۹

میرا نیارا وطن

میرا جہاز ہوا میں اڑنے ہی والا تھا۔ خوشی سے میرے جسم کا ایک ایک انگ جیسے پھڑک رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے سینے سے دل اچھل کر باہر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔

میری ماں کی دونوں آنکھیں نم تھیں مگر وہ اپنے آنسوؤں کو چھپا رہی تھی۔ اور مجھے یہ احساس دے رہی تھی کہ مجھے تمہارے جانے کا کوئی دکھ نہیں۔

مگر میں جانتی تھی اسکے سینے سے بھی دل باہر آنا چاہتا تھا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی۔ مجھے گھر سے جانے سے روکنا چاہتی تھی۔ مگر اس کی زبان پر تالے تھے جسکی وجہ سے اس کا منہ

بند تھا۔

میری دونوں بڑی بہنیں دلّی میں ہی پڑھتی تھیں۔ایک ایم ایس سی کر رہی تھی اور دوسری بی کام۔

اور آج میں، ماں کی تیسری بیٹی، بھی دلّی جا رہی ہوں پڑھنے کے لئے۔مجھے دلی کالج میں بی اے کے لئے داخلہ مل گیا تھا۔

میرے نکلنے سے میرے دونوں ماں باپ گھر میں اکیلے ہو چکے تھے۔۔۔مگر ان کے آنسوؤں سے میرے دل پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔میرا دل اندر ہی اندر ہچکولے کھا رہا تھا۔

دلّی، ایک ایسا شہر جس کی تعریفیں میں بچپن سے سنتی آ رہی ہوں۔دلّی جو دل ہے ہندوستان کا۔دلی ہے دل والوں کی، ہمارے ملک کا دل۔ہمارے سے زیادہ میرے ملک کا دل۔کیونکہ میں تو پوری کی پوری ہندوستانی ہوں۔مجھے ہندوستان سے زبردست لگاؤ ہے۔ہندوستانی کرکٹ، ہندوستانی کپڑے، ہندوستانی ساڑھی، ہندوستانی گہنے، ہندوستانی ہونے کا احساس، میرا روم روم جھوم رہا تھا۔میں نے ہندوستانی ساڑھی صرف فلموں میں دیکھی تھی۔اور میرے دل ہی دل میں بہت شوق تھا کہ میں اس شہر کو دیکھوں، اس شہر میں جا کر رہوں جس کو میں نے بارہا خوابوں میں مشاہدہ کیا تھا۔

غالب کا شہر۔اردو کا شہر۔غالب اکادمی کا شہر، پالیمنٹ والا شہر۔۔۔۔۔پارلیمنٹ دیکھنے کا شوق مجھے کس قدر تھا۔اللہ میں اب اپنی آنکھوں سے پارلیمنٹ ہاوس دیکھوں

گی۔ قطب مینار اور لال قلعہ کا شہر۔ چاندنی چوک، اصدر بازار، افوہ کس دن ان سب کا دیدار اپنی نظروں سے کروں گی۔

مغلوں نے نہ صرف میرے شہر کشمیر جنت بے نظیر میں اپنی دل انگیزیاں اور سحر انگیزیاں جگہ جگہ بچھائی تھی۔ بلکہ پورے ہندوستان میں کچھ کچھ اپنے آثار چھوڑے ہیں۔

جہاز کا دروازہ بند کیا گیا اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی۔ جہاز میں جانا بھی میرا پہلا تجربہ تھا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں میں جہاز کی اونچائی سے ڈر نہ جاؤں۔ جہاز اونچا اڑنے لگا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ مجھے ایک دم ماں کی بات یاد آئی۔

''اگر جہاز میں دل ڈوبنے لگے یا سر چکرانے لگے تو ایکدم اپنا سر نیچے جھکا لینا، ایک لمحے میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

ماں کا نسخہ کام آیا اور میں بالکل ٹھیک ہو گئی۔ اب سفر آسان ہو گیا اور میں نے بھی اپنی جیب سے آئی پوڑ (I POD) نکالا اور کانوں میں ائیر فون ڈالے اور بس۔۔۔ اپنی دنیا میں کھوگئی۔

کچھ دیر میں ائیر ہوسٹس نمودار ہوگئی۔ اور اس کے اشارے مجھے نظر آئے۔ میں نے ایکدم کانوں سے ائرفون نکالے اور وہ کہہ رہی تھی۔

''جہاز میں کرسیوں کی پیٹی باندھے رکھئے۔ جہاز میں دو دوار آگے ہیں اور دو دوار پیچھے ہیں۔ ایمر جنسی کے بھی دو دوار ہیں۔۔۔۔۔ آکسیجن کم ہونے پر ایک ماسک خود بخود اترے گا اسے پہن لیجئے۔'' اور وہ کہہ رہی تھی کہ سیٹ کے سامنے پڑے

کارڈ کو غور سے پڑھیے۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ

''یہ ائیر ہوسٹس تو مجھے ڈرا ہی دے گی۔بہتر ہے کہ میں اس کی بات ہی نہ سنوں''۔

میں نے پھر سے اپنے کان بند کر لئے۔اور اپنی دنیا میں کھو گئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے میں جہاز جموں ائیر پورٹ پر پہونچ گیا۔اور میں سمجھ گئی کہ دلی جانے سے پہلے جہاز کو ایک بار یہاں رُکنا تھا۔''اللہ امتحان بھی تو کتنا''؟

ایک اور گھنٹہ لگا اور دلی ائرپورٹ پر اب جہاز اترنے ہی والا تھا کہ میری دل کی دھڑکنیں ایک بار پھر تیز ہوگئیں اور یہ ''چیں۔۔۔۔۔چیں۔۔۔۔'' کے ساتھ جہاز زمین کو چھو گیا۔مجھے لگا جیسے زلزلہ آگیا۔میں نے اپنی سیٹ کی بازو کو یک لخت زور سے گرفت میں لیا اور خدا خدا کر کے جہاز رُک گیا۔

جہاز کا دروازہ کھلنے میں ذرا سی دیر لگی اور میں تب تک جہاز کے دروازے کے پاس پہونچ چکی تھی۔یہ ۔۔دروازہ کھلا۔۔۔اور یہ میں باہر آگئی۔۔

میرے سپنوں کے شہر میں میرا پہلا قدم۔گرم تھپیڑوں نے اترتے ہی میرا گرمجوشی سے استقبال کیا۔میں ادھر ادھر دیکھ رہی ہوں کہ گرم ہوائیں کہاں سے آرہی ہیں۔کہیں جہاز کا کوئی سرا تو میری طرف نہیں ہے جو مجھے بے انتہا گرمی کا احساس دے رہا تھا۔یہ گرمی کشمیر کی ٹھنڈ میں میری یخ بستہ ہڈیوں کو راحت پہونچا رہی تھی۔مگر اسکے بعد مجھے خیال آیا۔

''سائرہ جی یہ دلی کی گرمی ہے جو آپ کو خوش آمدید کہہ رہی ہے''۔

ائرپورٹ سے میں نے ایک paid taxi لے لی۔مجھے نئی دلی جانا تھا۔دن کے

بارہ بج رہے تھے اور گرمی اپنے زوروں پر تھی۔ میں نے ٹیکسی کے شیشے کھول دئے اور گرمی کو نظر انداز کرتے ہوئے دلی شہر کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میری نظروں سے کتنے ہی لوگ آ کر گذر گئے۔ کتنی عورتیں، کتنی لڑکیاں، ۔۔۔ مگر مجھے یہ سوچنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وہ شہر نہیں ہے جہاں اب بھی عورتیں ساڑھی پہنتی ہیں۔ مجھے تو یہ شہر اسی لئے زیادہ اچھا لگتا تھا۔ میں نے سُنا کہ ہندوستان میں عورتیں سوٹ سے زیادہ ساڑھی پہنتی ہیں۔ میں نے اکثر لوگوں کو پینٹ اور ٹی شرٹ پہنے دیکھی۔ اور اور کچھ سوٹ بھی پہنے ہوئی تھیں۔ مگر اس ڈریس کا تیسرا حصہ جو میں نے بچپن سے آج تک گھر میں دیکھا تھا۔ شلوار، قمیض اور ڈوپٹہ۔۔۔ ڈوپٹہ ان کے سر سے ہی نہیں شانوں سے بھی غائب تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ ان کو دیکھ کر ہی مجھے شرم آ رہی تھی۔ یہ لڑکیاں کیسے بنا ڈوپٹے کے اور بال کُھلے ۔۔۔؟

ساڑی کی وہ لچک، ساڑھی کی وہ چوڑیاں، ساڑھی کا وہ پلو، اندر کا بلوز اور پٹی کورٹ ۔۔ وہ سب کہاں تھا؟

پڑھنے پڑھانے کی باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اور سب سے پہلے دلی جا کر میں دلی ہی دیکھوں گی۔

دوسرے دن دل والوں کے شہر دلی کو دیکھنے کے لئے میں نکل پڑی۔

میرا دل جگہ جگہ ٹوٹ گیا۔۔ ساڑھی کا شہر، ۔۔۔ غالب کا شہر ۔۔۔ اردو کا شہر ۔۔۔

پارلیمنٹ، لال قلعہ، قطب مینار، یہ سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں۔ مغلوں کے وجود کا احساس بری طرح انسان کو ہلا کر رکھتا ہے۔ مگر ان کا رنگ بھی بدلا بدلا نظر آ رہا تھا

مگر مجھے اب ان سب سے زیادہ اپنے کشمیر کا احساس محبت اندر ہی اندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

سر سے پیر تک ڈھکا ہوا لباس۔۔۔۔

مغلوں کے باغات۔۔۔

پھل اور پھولوں سے لدے پیڑ۔۔۔

خوشبو، تازہ ہوا، خنک ہوائیں، باغ، باغیچے، کھیت، کھلیان، دریا، اُبلتے چشمے، آبشار، ڈل، جھیلیں۔۔۔ کتنی ساری کشمیر کی یادیں ہیں جو مجھے کشمیر سے باہر کہیں نہیں ملنے والا۔

پڑھنا تو مجھے بہر حال ہے مگر اپنے شہر، اپنی mother land کو بھولوں گی کیسے؟
میں نے جلدی سے فون اٹھایا اور ماں کا نمبر نکالنے لگی۔

''ہیلو ماں'' میں تمہارے پاس واپس آ رہی ہوں''

☆☆☆

۱۰

سازش

"اگر میری شادی اسکے ساتھ نہ ہوئی تو میں زہر کھالوں گا"

ارشد نے گڑ گڑاتے ہوئے اپنی بہن سے کہا۔ اسکی بہن کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔

اس نے کہا؛

بھائی تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیا تو نرگس پر لٹو ہو گیا ہے۔؟ وہ تو۔۔۔

وہ تو بیوہ ہے میں جانتا ہوں مگر میری بہن تمہیں اس کا اندازہ بھی نہیں ہے کہ میں اسکو اپنی سانسوں میں محسوس کرتا ہوں۔ اس کا بیوہ ہونا اس کا قصور تو نہیں۔ میرے ہر طرف وہی نظر آتی ہے۔ اور کوئی نہیں۔ میں اسے بہت بہت پیار کرتا ہوں۔ کہانا۔ اگر مجھے وہ نہ ملی تو میں زہر کھاؤں گا۔

"بھائی میرے، اگر مجھے تمہاری شادی کے لئے اپنی جان بھی دینی پڑے' میں تب بھی گریز نہیں کرتی۔ مگر اب نرگس کے بارے میں کیا کہوں اگر ابا نے نہیں مانا تو۔۔۔"

پھر کچھ سوچ کر کہا۔

''میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ اب اگر تمہاری شادی ہوگی تو وہ نرگس کے ساتھ ہی ہوگی'' نجم نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔ ''مگر ایک بات ہے۔ تمہیں ابا کو سب سچ بتا نا ہوگا۔''

ارشد نے بھی اس بات کی حامی بھری کہ وہ ابا سے اس کے بارے میں سب سچ ہی بتائے گا کہ وہ بیوہ ہے۔

ارشد نجم کا چھوٹا بھائی تھا۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے اتنا پیار کرتے تھے کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ اگر ایک چاند تھا تو دوسرا چاندنی، ایک پھول تھا تو دوسرا اسکی خوشبو، ایک بادل تھا تو دوسرا بارش، ایک اگر سورج تھا تو دوسرا اسکی روشنی، ایک اگر دیا تھا تو دوسرا اجالا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ایک دوسرے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ دونوں سارا سارا دن باتیں کرتے تھے۔ راز و نیاز کی باتیں' کالج کی باتیں ' سکول کی باتیں 'یونیورسٹی کی باتیں ' لڑکیوں کی باتیں ' لڑکوں کی باتیں ' ہنسی مذاق ' کھیلنا کودنا سب اکھٹے ہوتا تھا۔ راتوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ اور باتیں کر کر کے ان کا جی نہیں بھرتا تھا۔ دونوں بہن بھائی کنوارے تھے۔ اور دونوں یونیورسٹی میں کام کرتے تھے۔ تمام دن کی کہانیاں ایک دوسرے کو سنانا اور لوگوں کا مذاق اڑانا ان کی عادت بن چکی تھی۔

لیکن اب بھائی بے چارہ۔۔۔ نرگس کی محبت میں دیوانہ ہو چلا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے پہلے کہ نرگس کے ماں باپ اسکی شادی دوبارہ کہیں اور طے کر دیں، ہمارے گھر والے اسکے گھر جا کر اسکا ہاتھ ان سے مانگیں۔ اسی لئے وہ بہن کے آگے پیچھے منڈلا رہا تھا۔ کیونکہ ابا کے سامنے اسکی بولتی بند ہو جاتی تھی اور پھر پیار و محبت کا سلسلہ؟۔ اگر ابا نے

کچھ الٹا سیدھا سوال کیا تو کیا جواب دے گا۔ اگر اس نے ایسا پوچھا، ویسا پوچھا تو کیا جواب دے گا۔ ابّا کے پاس جانے کی جرائت ہی نہیں جٹا پا رہا تھا۔ اسی لئے اپنی مدد کے لئے بہن کا ساتھ چاہیے تھا۔

نرگس ایک بہت اچھی لڑکی تھی۔ وہ کس زمانے میں ارشد کی ہم جماعت تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اسکی بڑی بڑی آنکھیں اور اس پر لمبی لمبی پلکیں، سفید موتی کی طرح چمکنے والے دانت، چھوٹے چھوٹے لال ہونٹ وہ ان پر تب بھی فدا تھا۔ مگر جب اسکی شادی ہوگئی تو اس نے اپنی محبت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنی محبت کے ارمانوں کو سینے کی زمین میں ہی دفن کیا تھا۔ اور اپنے ہونٹوں پر اس کی داستان بھی نہیں لایا تھا۔ مگر شادی کے چند ہی مہینوں کے بعد جب اسکا شوہر ایک حادثہ میں اپنی جان کھو بیٹھا تب جس کے دل میں سب سے زیادہ نرگس کے لئے بُرا لگا وہ ارشد تھا۔

۔۔۔ اور اب اسکی محبت پھر سے جاگ گئی۔

نجم بھی ابّا سے یہ بات بولنے سے ڈر رہی تھی کہ ارشد عشق کی بلا میں گرفتار ہے۔ وہ ابّا سے بہت محبت کرتی تھی۔ لیکن وہ ارشد سے بھی بے حد محبت کرتی تھی۔ وہ دل سے چاہتی تھی کہ ارشد کو اس کی محبت مل جائے۔ مگر ابّا کے سامنے زبان کیسے کھولے۔ ابّا کو کیسے یقین دلائے کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ وہ پریشان تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر ابّا نے اس کے بیوہ کے ساتھ رشتہ کرنے سے اعتراض کیا تو کیا جواب دے گی۔

کئی راتوں تک ارشد کی محبت اسکے دماغ میں سوال بن کر ابھرتی رہی۔ اور یہاں ارشد اسکے جواب کے لئے تڑپ رہا تھا۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ بات کرے تو

کہیں ابا ناراض نہ ہو جائے۔بات نہ کرے تو ارشد ناراض ہو جائے۔آگے کنواں پیچھے کھائی۔

آخر کار بھائی کی محبت نے غلبہ پالیا اور نسکو ابا کے سامنے یہ بات صاف صاف کرنی پڑی۔ بہت دیر تک نجم اور ابا کے درمیان گرم گفتگو ہوتی رہی اور آخر کار نجم نے ابا کو یہ کہکر منالیا کہ

''اگر ہم اسکی شادی نرگس سے نہ کردیں تو یہ لڑکا گھر چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہو جائے گا۔اور آپکی مرضی کے بغیر اسکے ساتھ شادی کرے گا جیسا وہ کہہ رہا تھا۔اس وقت آپ کی عزت کہاں جائے گی۔کیا اس سے بہتر یہ نہیں ہے کہ چپ چاپ بنا فساد کھڑا کئے ارشد کی شادی نرگس سے کردیں گے۔ارشد کی بات بھی رہ جائے گی اور آپ کی عزت بھی برقرار رہ جائے گی۔وہ لڑکی بہت اچھی ہے۔اور اس میں اس کا قصور تو نہیں جو تقدیر نے اس کے ساتھ کیا ہے۔تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔یہ ضرب المثل تو آپ ہی کہتے ہیں''۔

آخر کار ابا نے یہ بات مان لی اور دونوں کی شادی کرادی۔بڑی دھوم دھام سے شادی ہوگئی۔

شادی ہوئی نہیں کہ نجم کا پانسہ پلٹ گیا۔نجم کا وجود جیسے ارشد کی زندگی میں تھا ہی نہیں۔نجم نے جیسے اپنے بھائی کو کھو ہی دیا۔ وہ صرف اپنی بیوی نرگس کا ہو کر رہ گیا۔آگے نرگس، پیچھے نرگس ،نرگس کے سوا کوئی بھی نہیں۔۔کچھ بھی نہ تھا۔اور نجم ۔۔وہ تو جیسی تھی ہی نہیں۔

مگر ابھی سال بھر بھی گذر نہیں پایا تھا نہ جانے کیوں میاں بیوی میں تکرار ہونے لگی۔بات بات پر تو تو میں میں ہوتی تھی۔نجم حیران تھی کہ یہ سب کیا ہے۔جس نرگس کے لئے وہ پاگل ہو رہا تھا۔جسکے لئے گھر والوں کی پروانہ کی۔اسکے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔لیکن

بات کرنے کی مجال اب کس میں تھی۔ وہ جو چاہتا تھا کرتا تھا۔
آہستہ آہستہ یہ تکرار تو تو میں میں پر پہونچ جاتی۔ گھر بھر پریشان تھا کہ آخر یہ کیا ہوا اور کیوں ہوا۔ سارے گھر کو یہ بات معلوم تھی کہ ابا اس رشتے پر راضی نہیں تھے۔ اور ان کو بڑی مشکل سے منایا گیا ہے۔ مگر اب سب کی ہونٹوں پر مہر تھی۔

ایکدن تو تو میں میں اس قدر بڑھ گئی کہ اس نے جھگڑے کی شکل اختیار کرلی۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر چلا رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اب محلے والوں پر بات آئے گی۔ ان دونوں کا جھگڑا اس سے زیادہ نہ بڑھے نجم ان دونوں کے بیچ میں آئی۔ اسنے اپنے بھائی کو سمجھانا چاہا۔ لیکن ارشد نے بڑے غصہ سے بہن کو پیچھے دھکیل دیا اور کہا۔

''باجی آج فیصلہ ہوجائے گا۔ ہٹ جاؤ پیچھے۔''

''کیسا فیصلہ میرے بھائی۔''؟

''اس سارے فساد کی جڑ آپ ہیں''۔

''فساد ؟ کیسا فساد تم کیا کہہ رہے ہو مجھے تو سمجھ نہیں آرہا ہے''۔

''اب آپ کیسے سمجھ جاؤ گی۔ آپ نے ہی ابا سے ملکر میرے خلاف یہ سازش کی ہے۔''

''سازش؟۔۔۔۔سازش؟۔۔۔۔میں نے؟۔۔۔۔''

نجم نے اپنے ہونٹوں پر دونوں ہاتھ رکھے اور ایک آنسوں کی دھار اس کی آنکھوں سے جاری ہونے لگی۔ حیرانگی اور درد کا ایک ملا جلا تاثر اسے پریشان کرنے لگا۔

☆☆☆

۱۱

معافی

میں جانتا تھا کہ اگر میں اپنی ماں سے معافی مانگ لیتا تو وہ ضرور مجھے بخش دیتی۔ مگر میری جرأت نہ ہوئی کہ میں ان کے قریب جا کر ان سے نظریں ملاؤں۔ میں ان سے پوچھے بغیر سکول کے لئے نکل پڑا۔ میں تب نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میری ماں مجھے دروازے پر دیکھ رہی تھی۔ انکی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ جیسے آنسو باہر ٹپکنے کے لئے بے تاب تھے لیکن آنسو ٹپکنے سے پہلے ہی میں چل پڑا۔

مجھے آج تک یاد ہے کہ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ مجھے نویں کا امتحان دینا تھا۔ میں کتابوں میں کم اور کھیلنے میں زیادہ دھیان دیتا تھا۔ میری ماں

کو میری اس عادت سے چڑ تھی۔ وہ بار بار مجھے دیکھنے آتی تھی کہ میں پڑھتا ہوں یا کھیلتا ہوں۔ وہ کمرے میں آ گئی تو میں یونہی اپنی چیزوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میری ماں نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

''کیوں وقت ضایع کر رہے ہو۔ پڑھائی کیوں نہیں کرتے۔ امتحان سر پر ہے۔ پڑھو گے نہیں تو امتحان کس کا دو گے اپنے سر کا''۔

پھر ماں نے قدرے نرمی کا لہجہ اختیار کیا اور کہنے لگی۔

''دیکھو بیٹا' وقت انمول ہے۔ وقت کی قدر کرنا سیکھو۔ وقت سے ہی انسان بڑا بنتا ہے اور انسان کو وقت ہی انسان بنا دیتا ہے۔ جس شخص نے وقت کی قدر کی وہ جیتا اور جس نے وقت کو ضایع کیا وہ زندگی میں سب سے بڑی دولت گنوا بیٹھا۔۔۔''

ابھی ماں کہہ ہی رہی تھی کہ میں نے اسکی بات میں دخل اندازی کی اور غصہ اور نفرت بھری نگاہ سے اسکی طرف دیکھا اور چلا کر کہا۔

''ماں ذرا یہ بھاشن واشن بند کرلو۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ تم سے زیادہ میں جانتا ہوں کہ وقت کیا ہوتا ہے۔ تمہیں کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جاؤ تم اپنا کام کرلو۔ اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

میری باتوں سے ماں کو دھچکا لگا میری بات سنتے ہی اسکی آنکھیں بھر آئیں اور وہ اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکی۔ لیکن اس ڈر سے کہ کہیں میں اسکے

آنسو نہ دیکھ لوں وہ وہاں سے بھاگ گی۔ اسکے بھاگنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے ماں کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ مجھے قطعی ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں کتنا پاگل ہوں۔ ماں کے دل کو کتنی ٹھیس پہونچی ہوگی۔

میں جب نیچے آیا تو دیکھا اسکے ہاتھ میں قرآن پاک تھا اور اسکی آنکھوں میں آنسو۔ وہ شاید دل ہی دل میں قرآن شریف کے سامنے اللہ تعالیٰ سے یہ مانگ رہی تھی کہ میرے بیٹے کو اسکی سزا مت دینا۔ یہ بچہ ہے' نادان ہے۔ اور میں نے اسکو معاف کر دیا۔'' میں آنکھیں نیچے کئے بِنا ماں سے اجازت لئے سکول چلا گیا۔

جب میں سکول سے واپس آیا تو میری ماں کسی دفتری کام کے سلسلے میں دہلی گی ہوئی تھی۔ اور میں دل ہی دل میں اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتا رہا۔ میں نے اس کے ساتھ فون پر بھی بات نہیں کی اور نہ ہی اس نے مجھے فوں پر بُلایا۔

میں آج بھی ' جبکہ آج میرے بچے بھی اب سکول جاتے ہیں اور میرا بڑا بیٹا نویں جماعت میں پڑھتا ہے' اپنے بچپن کو یاد کرتا ہوں اور میں ہمیشہ اپنی ماں کو سامنے پاتا ہوں۔ اسکی آنسوؤں سے نم آنکھیں میری نظروں کے سامنے ہوتی ہیں۔ کاش میں نے ماں سے معافی مانگ لی ہوتی!

کاش میں اپنے غصہ پر قابو پالیتا!

کاش میں نے ماں کو نہ ڈانٹا ہوتا!

اس دن کے بعد سے اس نے مجھے کبھی نہیں ڈانٹا۔ اس نے مجھے کسی بری چیز سے نہیں روکا۔ اور اس دن کے بعد اسنے مجھے آنکھ اُٹھا کر جی بھر کر کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے جب بھی اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کی اسکی آنکھیں بھر آتی تھی۔

اور ایکدن ماں کا دل اچانک بیٹھ گیا۔ اسکو ہسپتال لے جایا گیا۔ لیکن اس نے آنکھیں نہ کھولی۔ اور بات بھی نہیں کی۔ ھم سب نے لاکھ جتن کیئے لیکن وہ کچھ نہ بولی اور ھم سب کو چھوڑ کر چلی گی۔

۱۲

پرچھائیاں

''ہائی ئی؟''

''کیا حال ہے''

''آج میری یاد آئی''

''گدھی، کُتی، تم کو تو گئے ہوئے دو مہینے ہو گئے؟ آج مجھ کو فون کرتی ہے،؟''

''اوہ، شِٹ، شِٹ (shit,shit)''

''گڈ، گڈ، ویری گڈ''

''کب آ رہی ہو' نیا سکول کیسا ہے؟''

''کس کا برتھ ڈے؟ اوہ۔۔ ہو۔۔ چلو اگر آئے گی تب ملیں گے۔''

''بس میرا کیا۔ وہی سکول، وہی دوست، وہی باتیں اور سکول کا کام۔''

''کچھ نیا نہیں۔ بس چل رہا ہے''۔

''تم کو بہت مِس کرتی ہوں۔''

''شِٹ، شِٹ۔ پلیز رؤمت، پلیز''

''اچھا ابھی آؤ گی۔ چلو آؤ میں انتظار کر رہی ہوں۔ اچھا مما بھی ساتھ ہے؟ او۔ کے آ جاؤ۔ اوکے اوکے۔''

بٹیا فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ شاید کسی ایسے دوست سے بات ہو رہی تھی جو دو مہینے پہلے کہیں گئی تھی۔ اور شاید اب نئے سکول میں بھی داخلہ لیا ہے۔ اور شاید واپس بھی آ رہی ہے۔ اس کی باتیں سنتے سنتے اس کی ماں نرگس کو بھی اپنے کسی دوست کی یاد آ گئی تھی۔ جو برسوں پہلے اس سے دور گئی تھی۔ برسوں بیت گئے مگر اس کے ساتھ کبھی ملاقات ہی نہیں ہو سکی تھی۔ اس کی صرف یاد آتی ہے۔ نہ کبھی وہ خود آتی ہے اور نہ کبھی اس کا فون، اور نہ ہی کبھی اس کی چٹھی۔ گئی تو ایسے گئی کہ جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ آج بھی جب اس کھڑکی پر نظر پڑتی ہے تو آنکھیں بھر آتی ہیں کہ شاید کھڑکی کھل جائے گی۔ شاید کوئی سر پر ڈوپٹہ لئے، لہراتی ہوئی اس کھڑکی پر دکھائی دے گی۔

بارشوں کا موسم تھا۔ ہر طرف ہریالی چھائی ہوئی تھی۔ دن کو کڑی دھوپ کے بعد سہ پہر کے ہوتے ہوتے کہیں سے بادل آ کر پورے آسمان پر چھا جاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا آسمان کالے بادلوں کے نیچے چھپ جاتا اور بارش شروع ہو جاتی۔ اور ہوائیں اتنی زور زور سے چلتی کہ درختوں کے پتوں کی صرصراہٹ ایک

عجیب سی آواز فضا میں پیدا کر دیتی۔ دن میں دھوپ شام کو بارش بہت مزے دار موسم تھا۔

نرگس اپنے مکان کی ایک کھڑکی کے نزدیک چوکی پر بیٹھ کر اس پُر کیف نظارے کا نظارہ کر رہی تھی کہ بارشوں کے بیچ میں اگلے مکان کی چوتھی منزل کی ایک کھڑکی کھل گئی اور ایک نوجوان لڑکی نمودار ہوئی۔ سر پر سبز رنگ کا ڈوپٹہ جسکا ایک سرا ہاتھ میں تھا اور وہ اس کو ہوا میں لہرا رہی تھی۔ نرگس اور اس لڑکی نے ایک دوسرے کو بارشوں کے بیچوں بیچ دیکھا اور اپنی اپنی جگہ دونوں جیسے خوش ہو گئے۔ دوسرے دن رات کی بارش نے سارا شہر دھوڈالا تھا، صبح کی دھوپ نے اس کو تر و تازہ کیا۔ سارا شہر جیسے دھلا ہوا سجا سجایا لگ رہا تھا۔ درختوں کے پتے، بیلیں اور سفیدے سب دھلے ہوئے تھے۔ اور ان کا رنگ جیسے نکھر آیا تھا۔

چوتھی منزل کی کھڑکی پھر سے کھلی۔ اور سونی من موہنی سی صورت نظر آنے لگی تھی جو رات سبز ڈوپٹہ اور سوٹ میں ملبوس تھی۔ آج اس نے میرون رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ نرگس نے اس کو دیکھا اور ہاتھوں کے اشارے سے سلام کیا۔ اس نے بھی اشارے سے سلام کا جواب دیا۔ اس کے بعد نرگس نے دیوار پر آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے بھی دیوار کے ایک کونے کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ نرگس اٹھی اور دیوار کی طرف جانے لگی۔

نرگس کے باپ کو اس مکان میں آئے ہوئے صرف ایک ہی مہینہ ہوا تھا۔ نیا گھر اور نئی جگہ تھی۔ نئے نئے لوگوں سے ملنے کی توقع تھی۔ نرگس سولہ سالہ ایک نوعمر

لڑکی نئے دوستوں کی تلاش میں تھی۔ ابھی حال ہی میں نیا سکول بھی جوئن کیا تھا۔ اور نئے سکول میں بھی نئی نئی لڑکیوں سے بھی ملتی تھی۔ مگر ابھی کسی کے ساتھ اتنی دوستی بھی نہیں ہوئی تھی۔

اتنے میں نرگس دیوار کے پاس پہونچی تو دوسری طرف سے بھی وہ ننھی منی سی لڑکی بھی دیوار کے پاس پہونچ گئی۔ اس نے سلام کر کے کلام کی پہل کی۔

''اسلام وعلیکم''

''اسلام علیکم''

''آپ یہاں نئے آئے ہو؟''

''جی''

''کیا نام ہے''

''نرگس اور آپ کا؟''

''راحیلہ''

''کس کلاس میں پڑھتی ہو''

''میں دسویں میں''

''کہاں پڑھتی ہو۔''

''گورنمنٹ سکول میں''

''اوہ۔ میں بھی۔ چلو کل سے اکھٹے جایا کریں گے۔ سکول جاتے وقت مجھے آواز دے دینا اور میں آوں گی۔ ٹھیک ہے؟''

''چلو، خدا حافظ''

''خدا حافظ''

دونوں لڑکیوں کے گھروں کا گیٹ بہت الگ الگ جگہ پر تھا۔ایک کا گیٹ ایک محلہ میں کھلتا تھا اور دوسرے کا گیٹ دوسرے محلے میں ۔اس لئے سکول جو سب سے زیادہ نزدیک تھا وہ نرگس کے گیٹ کی طرف تھا۔اسی لئے راحیلہ نرگس کے گھر جانے کے لئے رضا مند ہوگئی۔اب سکول، بازار یا کہیں اور، جہاں بھی جانا ہوا کھٹے جانا ہوتا۔

سکول کے بعد کالج جانا بھی ایک ساتھ ہوا اور کالج کے ساتھ ساتھ ادھر اُدھر، گھر، رشتہ دار، شادیاں جہاں ایک کو جانا ہوتا تو دونوں سہیلیاں چلی جاتی۔نرگس کے رشتہ دار راحیلہ کو جاننے لگے اور راحیلہ کے رشتہ دار نرگس کو جاننے لگے۔دونوں کے رشتہ داران دونوں کو پسند کرنے لگے کیونکہ وہ ایک جان دو قلب ہوگئے تھے۔

پھر ایکدن ایک اجنبی آیا اور اس نے راحیلہ کو دیکھا۔دیکھتے ہی راحیلہ سے شادی کے لئے تیار ہوگیا۔۔راحیلہ ابھی بی اے کا امتحان بھی نہ دے پائی تھی کہ اس کے امی اور ابو اسکی شادی کے لئے رضا مند ہوگئے۔دیکھتے ہی دیکھتے دنوں اور ہفتوں میں شادی کی تیاریاں ہوگئیں۔

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں ایسا لڑکا بھیج دیا۔'' راحیلہ کی امی نے اس کے ابو سے کہا۔

''ہاں بھی، میں تو کہتا ہوں لڑکا تو اتنا اچھا ہے کچھ بھی دینا نہیں ہے جہیز میں۔اب

ہم صرف صرف کچھ سونے کی چیزیں دیں گے تاکہ دلی ساتھ لے جاسکے۔'' راحیلہ کے ابّو نے جواب دیا۔

''سونے کے سکوّں کے علاوہ صرف بارات میں سوسوا سو لوگوں کا کھانا دینا ہے۔اور بس''

''ہمیں تو اللہ کا احسان ماننا چاہیئے۔ کیونکہ ہماری تو چار بیٹیاں ہیں۔ میں ہمیشہ سوچتی تھی کہ کیا ہوگا۔ابھی بڑی نے بی اے بھی نہیں کیا کہ اس کے لئے گھر اور ور دونوں بہت اچھے مل گئے''۔

''اللہ کا شکر ہے ۔اب راحیلہ کو بی اے کا امتحان دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے' 'راحیلہ کی امی نے کہا۔

''میں تو چاہتا تھا کہ بی اے کرلیتی ۔۔مگر''

''ان کو کس چیز کی ضرورت ہے۔دلی میں اپنا فلیٹ ہے، سرکاری نوکری ہے۔ماں باپ بھی کسی نواب سے کم نہیں ہیں۔وہ صرف ہماری لڑکی مانگتے ہیں۔اصل میں جی وہ اللہ والے ہیں۔''

ڈھولکیوں کی آواز، چوڑیوں کی کھنکار، پائل کی جھنکار میں راحیلہ اپنی پڑھائی بھول گئی۔ایک نئی دنیا میں قدم رکھنے کی خوشی ، نئے کپڑے، نئے جوتے، گہنے، ایک نئے شخص سے ملنے کی اور دوستی کرنے کی چاہ، ایک نئے گھر میں رہنے اور نئے لوگوں سے ملنے کی چاہت میں اپنے میکے کو بھولنے کو تیار ہوگئی۔

انگوٹھیوں سے بھرے ہاتھوں سے، چوڑیوں بھرے کلائیوں سے اپنے لال

ڈوپٹے کے گونگھٹ کو پیچھے ہٹاتے نرگس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ ''نرگس بولو۔ مجھے بھول تو نہ جاؤ گی۔''

نرگس ہونٹوں کے کنارے اپنے دانتوں میں دبائے اور آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سر سے انکار کرتی رہی۔

دروازے پر گھنٹی بجی۔ اور پھر گھنٹی بجی۔

نرگس نے اپنی بیٹی کو آواز دی اور کہا۔ ''بیٹی ذرا دیکھو تو دروازے پر کون ہے۔''

''مما یہ میری فرنڈ زیتون ہے۔ مما آنٹی بھی اس کے ساتھ ہے۔''

نرگس جلدی سے اٹھی اور زیتون کی مما کو دیکھنے گئی۔

''۔۔۔ارے۔۔۔۔ارے۔۔۔'' اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گیں۔را۔۔۔حی۔۔۔لا۔۔۔راحیلہ۔۔۔آج ۔۔۔۔بیس سالوں کے بعد ۔۔۔'' دونوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ دونوں بیٹیوں نے ایک ساتھ تقریباً چلا کر کہا۔ ''مما۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

☆☆☆

۱۳

پرورش

ایک دن ماں کو کہیں دعوت پر جانا تھا۔اور رات کے وقت کی دعوت تھی۔اور یہ رات تو وہاں ہی گذارنی تھی۔اور ماں۔۔۔کو اندر ہی اندر یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ اگر میں چلی گئی تو ان بچوں کو کون دیکھے گا۔وہ کسی نہ کسی طرح دعوت پر جانے سے منع کر رہی تھی۔مگر کوئی نہیں مانتا تھا۔کسی کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ ماں انکار کیوں کر رہی ہے۔

"بابا آپ کو معلوم ہے کہ ماں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی ہے۔"

"بچے؟

"۔۔اچھا وہ۔۔۔ارے بیگم میں ہوں نا۔۔آپ چلے جایئے۔۔۔ایک دن ہی کی تو

بات ہے۔میں اُن کا خیال رکھوں گا۔‘‘

’’جی۔۔۔جی۔۔اصل میں بچے بڑے تیز ہو گئے ہیں۔اگر ان کو ذرا سی چھوٹ دی گئی تو بلی ان پر جھپٹ پڑے گی یا چیل ان کو اپنے پنجوں میں لے جائے گی‘‘۔

’’ارے ہم ان کو بلی کے حوالے نہیں کریں گے اور نہ ہی چیل کو لینے دیں گے۔ہم ان کا خاص خیال رکھیں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔۔۔‘‘ماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔اور مجبوراً جانے کے لئے حامی بھری۔

میری ماں نے بڑی گرم گرم چیزیں ان کے اردگرد سجائی تھیں تا کہ بچوں کو سردی نہ لگے۔وہ دن میں چار پانچ بار ان کو دیکھتی، ان کو پانی پلاتی اور ان کو چاولوں کے دانے ڈالتی۔اسکا دل ان بچوں کو دیکھ کر اسقدر باغ باغ ہو جاتا تھا کہ وہ چاہتی تھی ان کو اپنی گود میں لے کر کے اپنے پاس رکھے۔ان کو چومے اور ان کو پیار کرے۔مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔۔۔کیونکہ ان کی ماں انکو ہاتھ لگانے بھی نہیں دیتی تھی۔چار بچے اور ان چاروں کے الگ الگ رنگ، ایک سفید، ایک کالا، ایک پیلا ایک بھورا۔سب کے سب بہت پیارے تھے۔اور سار دن ان کا چوں۔۔۔چوں۔۔۔چوں دل کو بھاتا تھا۔ان میں سے سب سے پیارا اور سب سے شریر پیلا والا تھا۔ابھی در کھلا نہیں کہ بھاگ گیا۔دانہ ڈالا نہیں کہ چٹ کر گیا۔کبھی ادھر بھاگتا تھا تو کبھی ادھر۔جب میری ماں اسکو پکڑنے کی کوشش کرتی تو وہ بھاگ جاتا تھا۔اور ماں کی سانس اسکے پیچھے دوڑ دوڑ کر پھول جاتی تھی۔اور آخر کار اسکو پکڑ

کر اپنی ماں کے دامن میں ڈالتی تھی اور سو جاتی تھی۔

ماں ان کو گھنٹوں دیکھتی اور اسے یہ دیکھنے میں کتنا مزہ آتا تھا۔ کیونکہ میں بھی کبھی کبھی ماں کے ساتھ ان کو دیکھنے کے لئے بیٹھتا۔ اور کبھی کبھی ماں کتنا زور سے چلاتی تھی۔ ''دیکھو منا پیلا والا کیسے ماں کی پیٹھ پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے بالکل تمہاری طرح۔۔۔''

''ہاں ماں''

''دیکھو دیکھو کیسے ماں کی چونچ سے سبزی کا ٹکڑا نکال رہا ہے''

''ماں تم ان کو دیکھ کر اتنا خوش کیوں ہوتی ہو۔''؟

''کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ یہ بھی میرے اپنے بچے ہیں۔ میں ان کو بھی اسی طرح پالتی ہوں جس طرح میں نے تمہاری پرورش کی ہے۔

میری ماں کو طرح طرح کے جانور پالنے کا بہت ہی شوق تھا۔ وہ بکریاں پالتی، مرغے پالتی، کبھی باہر جاتی وہاں سے ہرے، پیلے، نیلے رنگ کے پرندے لاتی اور ان کو پالتی۔

گھر میں مرغیوں کے انڈے کھانے کو کبھی نہیں ملتے تھے۔ کیونکہ ماں کہتی تھی کہ ان کہ انڈے کھانے ہوں تو بازار سے منگا کے کھائیں۔ میری مرغیوں کے انڈے تو ان کو بچے نکالنے کے لئے ہیں۔ اور پھر انڈے جمع کر کے ان سے چوزے نکلواتی۔

ماں صبح سویرے اٹھتی، خود چائے پیتی اور دوڑ کر اپنے چوزوں کو دیکھنے جاتی۔

''آج کچھ بڑے ہونے لگے ہیں۔''

''آج سفید والے کے پر نکل آئے ہیں۔''

''اور پیلا والا تو۔۔۔پیلا والا تو۔۔جیسے اسکے منہ پر داڑھی اُگ آئی ہے۔اسکی پیشانی پر ایک کالا داغ نکل آیا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ نمازیں پڑھ پڑھ کر پیشانی پر کالا دھبہ پڑ گیا ہے۔جو اتنا خوبصورت لگتا ہے کہ میں بار بار اسکو چومنا چاہتی ہوں۔''

آخر کار وہ دعوت پر جانے کے لئے تیار ہو ہی گئی۔اور ایک رات کے بعد وہ دعوت سے ہو کر جو گھر آئی تو گھر میں سب چپ چپ تھے۔

ماں نے آتے ہی پوچھا۔''میرے چھوٹے چھوٹے تو ٹھیک ہیں۔۔''

''نہیں ماں۔۔۔پولیس نے چھاپہ ڈالا۔۔۔سب بچوں کا کریک ڈاون کیا۔اور تمہارے سب سے پیارے اور تیز اور ہونہار بیٹے کو لے گئی۔اسی بیٹے کو جس کے منہ پر داڑھی اُگ آئی تھی۔اور جس کی پیشانی پر نمازوں سے کالا داغ پڑ چکا تھا۔تمہارے اسی بیٹے کو لے گئی۔ اور۔۔۔''

''کیا؟۔۔۔۔کون۔؟۔۔۔۔۔کیسے''؟

''بابا ان کو کھانا ڈالنے گئے۔وہ سب بھاگ گئے۔اور اچانک اوپر طاق میں بیٹھی ایک چیل نے ایسا جھپٹا مارا کہ سب تتر بتر ہو گئے۔مگر آخر کار ایک کو اڑا لے گئی۔اور وہ تھا وہی تمہارا پیارا۔۔۔''

☆☆☆

۱۴

غصہ

ایک بڑی سی گاڑی گیٹ کے پاس آکر رُک گئی۔اور اسمیں سے لمبی لمبی ہیل والی چپل پہن کر صبرینا اتر گئی۔آنکھوں سے کالا چشمہ اتار کر پیچھے پیچھے آنے والے نوکر سے کہا۔

"چلو گاڑی میں سے mirror نکال دو۔مگر آرام سے۔" اسکے ساتھ ایک دوسرا ملازم بھی تھا۔دونوں گاڑی سے آیئنہ نکالنے لگے۔آدم قد آیئنہ اور کنارے اخروٹ کی لکڑی کے اور ان پر ہاتھ کی کھدائی۔اسقدر خوبصورت اور خوشنما تھا کہ نوکروں اور ملازموں کی تو آنکھیں ہی چندھیا گئیں۔

نوکروں نے آہستہ آہستہ آیئنہ حویلی کے اندر لایا۔اور بی بی جی سے پوچھا۔

"اسکو کہاں رکھیں۔"

"بس رکھدو۔۔اسکو لابی میں ہی لگوانا ہے۔۔۔"

بی بی جی گھر کی مالکن تھی۔وہ ایک بڑے ہی مالدار بزنس مین راشد صاحب

کی بیوی تھی۔ مرسڈیز اسکے آنے جانے کے لئے رکھی گئی تھی۔ اور اسمیں ڈرائیور سارا دن بیٹھ کر اس لئے انتظار کرتا تھا کہ بی بی جی کو کہیں جانا پڑے تو وہ حاضر ہے۔ مہینے میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کا خرچہ تھا۔ اور وہ یہ خرچہ خود ہی کرتی تھی۔ اسکے بچے اب بڑے بڑے ہو چکے تھے۔ اور وہ دونوں بھی بزنس میں ہاتھ بٹانے لگے تھے۔ بڑے نے MBA کیا تھا اور چھوٹا ابھی BBA کر رہا تھا۔ دونوں کا لگاؤ بزنس کی طرف بہت زیادہ تھا۔

بڑا بچہ سہراب بہت شریف زادہ تھا۔ دماغ سے کافی تیز مگر ماں باپ کی ہر بات مانتا تھا۔ اور جیسا وہ کہتے تھے ویسا ہی کرتا تھا۔ جو کھانے کو دیتے وہی کھاتا، جو پینے کو دیتے وہی پیتا۔ اسکی تو اپنی جیسے کوئی چاہ ہی نہیں تھی۔ ماں ہی اسکے ہر چیز کا خیال رکھتی تھی۔

مگر چھوٹا بچہ رستم تو ماشا اللہ۔۔ سچ کا رستم ہی تھا۔ وہ کسی کی نہیں سنتا تھا۔۔ جو من میں آتا تھا وہی کہتا۔۔ وہی کرتا۔۔ جو پہننا چاہتا تھا وہی پہنتا۔۔ جو کھانا چاہتا تھا وہی کھاتا۔۔ جو چاہتا اسی کی ضد کرتا۔۔ اور ماں کی بھی اسکی ضد کے آگے کچھ نہیں چلتی تھی۔۔ وہ بہت غصہ والا بھی تھا۔ اس کو بات بات پر بہت غصہ آتا تھا۔ اگر اسکی بات نہ مانیں تو غصہ۔۔۔ اگر ضد پوری نہ کی تو غصہ۔۔ اچھا کھانے کو نہ ملے تو غصہ۔۔ جلدی سے اس کے حکم کی تعمیل نہیں ہوئی تو غصہ۔۔ شاید اسی لئے ہر کوئی اسکی بات رکھتا تھا تاکہ اسکو غصہ نہ آئے۔

اس کا غصہ کوئی معمولی غصہ نہیں تھا۔ بلکہ جو سامنے آیا پٹخ دیا۔

ایک بار تو اپنا ہاتھ غصہ سے کھڑکی پر مارا۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ کر گرا اور کانچ ہاتھ میں لگ گئی۔ اور سات sitiches آئی۔

ایک بار کمپیوٹر کا ماؤس جب چلا نہیں تو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

ایک بار چائے کا گلاس دیوار پر دے مارا اور دیوار پر چائے کا داغ ایسا رہ گیا کہ نئے سرے سے رنگ و روغن کرنا پڑا۔

غصے کی چھوٹی چھوٹی وارداتیں تو ہمیشہ سے ہی ہوتی رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے سب پریشان تھے کہ اس کا غصہ کیسے قابو کیا جائے۔ اور سب سے زیادہ پریشان اس کا پاپا تھا۔ وہ اسکی روز روز کی توڑ پھوڑ سے تنگ آ چکا تھا۔ مگر پھر جب اسکا غصہ ٹھنڈا ہوتا تو خود ہی اپنے کیئے پر ہنس پڑتا۔

شام کو جب پاپا گھر آئے تو رستم کا کھلتا چہرہ دیکھ کر اندر ہی اندر خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ اور اپنے دل سے کہا۔ ''شکر ہے کہ آج جناب عالی کی جبین کھلی ہے''

''hello papa''

''کیسے ہو بیٹے؟ ٹھیک ہو''؟

اس کا پاپا خوش ہو گیا اور اسنے بات کو مزید آگے بڑھایا۔

''بیٹا کیا کیا تم نے MBA کے بارے میں کیا سوچا''۔

''سوچنا کیا ہے پاپا۔ میرا من نہیں ہے تو نہیں کروں گا''۔

''نہیں کروگے مطلب؟ پھر کیا کروگے؟''۔

''میں آپ کے ساتھ بزنس کروں گا۔ اور خوب سارے پیسے کماؤں گا۔ مجھے اب

پڑھنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''دلچسپی نہیں ہے؟ باپ کو غصہ آنے لگا۔''کیسی بات کرتے ہو۔ پڑھائی لکھائی پہلے ،بزنس بعد میں۔۔۔بزنس کے ساتھ ایک بار لگ گئے تو پھر پڑھائی کہاں ہوسکتی ہے۔آجکل کے زمانے میں بزنس مین بھی کولیفائیڈ ہونا چاہیئے۔ورنہ بزنس بھی نہیں ہو پاتی ہے۔۔''

''پاپا، اتنا تو پڑھ لکھ گیا نا جتنا مجھے ضرورت ہے۔۔''اسنے اپنی آواز پاپا سے بھی اونچی کی۔

''ضرورت؟ کیا پڑھائی بھی۔۔۔؟''پاپا کی بات کو کاٹ کر اس نے کہا۔

''پھر کیا پاپا۔۔۔ذرا مجھے بتاؤ آپ نے کیا پڑھا ہے۔۔کتنا پڑھا ہے۔۔کونسی ڈگری کی ہے جسکی وجہ سے آپ نے بزنس کی ہے۔۔''آواز اور بھی بلند ہوگئی۔۔

صبرینا دوڑ کر آگئی۔اسنے دیکھا کہ باپ بیٹے دونوں میں تو تو میں میں شروع ہونے لگی۔کہیں ایسا نہ ہو کہ رستم کا غصہ آسمان کو چھو جائے وہ اس پر پانی ڈالنے کی کوشش کرنے لگی۔

''اچھا چلو ٹھیک ہے۔۔۔اسکے بارے میں پھر بات کرتے ہیں''۔

''کب بات کریں گے۔۔۔''بیوی کی مداخلت شوہر کو اچھی نہیں لگی۔اسلئے اس نے اسکو بھی ڈانٹا۔

''ہاں ٹھیک ہے میں پڑھا لکھا نہیں ہوں۔مگر میرا زمانہ اور تھا اور تب بھی میں نے بی اے پاس کیا ہے۔وہ تب کا بی اے آج کے ایم اے سے بڑھ کر ہے۔مگر تم تو آج

بھی بی اے ہی کر رہے ہو۔ پھر کیا فرق ہے۔۔۔"

تکرار کے دوران رستم کے ہاتھ میں شیشے کا پیپر ویٹ آ گیا۔ پاپا اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔۔۔

اپنے بھائی کی طرف دیکھو۔۔۔ اسنے MBA۔۔۔"

بھائی کا نام سن کر رستم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔۔۔۔

"بھائی۔۔۔ بھائی۔۔ بھائی۔ صرف بھائی کی مثالیں دیتے ہو۔۔ نہیں ہوں میں بھائی جیسا۔۔۔۔ نہیں آتا ہے مجھے بھائی کی طرح پڑھنا۔۔۔۔ نہیں ہوں میں بھائی جیسا قابل۔۔۔۔۔ بس نہیں بننا ہے مجھے بھائی جیسا۔۔۔۔۔۔"

اس نے پیپر ویٹ اٹھایا اور اتنی زور سے دیوار پر مارا۔۔۔۔۔

اگر باپ کا سر ہوتا تو کب کے حصے ہو گئے ہوتے۔۔۔۔

دیوار پر لگا آدم قد آیئنہ شکار ہو گیا اور دھڑام سے گر گیا۔۔۔۔

ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فرش کے ماربل کے ساتھ ٹکرایا اور۔۔۔

غصہ سے بھی زیادہ تیز آواز سے سب ہکے بکے رہ گئے اور۔۔۔ صبرینا۔۔ دانتوں تلے انگلی دبا کے رہ گئی۔

۱۵

نڈر آنکھیں

وہ ایسی نڈر اور بے خوف تھی کہ میں اسکے ساتھ نظریں ملاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔انٹرویو کے دوران جب ایگزامنرس (examinars) اسسے سوال کر رہے تھے تو میں بھی ان میں ایک تھا۔ایک سوال کے جواب میں اس نے میری طرف مڑ کر سوال کا جواب دیا اور ایک شعر پڑھا۔

حسن سبزی بخط سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگ زمین بود گرفتار شدم

جب آخر کے دو لفظ کہے "گرفتار شدم" تو اسکے معنیٰ اسکی شریر آنکھوں میں اتر آئے۔اور میری طرف اسطرح دیکھا کہ میرے سارے بدن میں کپکپی سی طاری ہو

گئی۔ میں اسکی نظروں کی تاب نہ لا سکا اور میں نے اپنی نظریں دوسری طرف پھیر لی۔۔وہ میری اس حرکت کو بھانپ گئی۔اسکے ہونٹوں پر ایک جیت کی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

وہ کالج میں میری شاگرد تھی۔اور وہ کسی نہ کسی بہانے سے میرے سامنے آتی تھی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کرتی تھی۔ ہر بات پر مسکرانا اور ہنسنا تو جیسے اسکی عادت ہی تھی۔وہ کسی بات پر بھی غصہ نہیں ہوتی تھی۔سارا دن مذاق،ہنسی، گانا،یہی سب کرتی تھی۔مگر جب کلاس میں آتی تھی تو وہ کسی بھی intelegent student سے کم نہیں تھی۔پڑھائی میں بھی اسی طرح تیز جس طرح باقی چیزوں میں۔

کلاس میں بھی ہر سوال کا جواب سب سے پہلے وہی دیتی تھی۔میں اسکو ہر وقت کہتا تھا۔

''حاضر جواب ہوتم''

''شکریہ''

کہاں سے بن پڑتے ہیں یہ جواب تم کو''

''اپنے دماغ سے اور کہاں سے''

اسکے جواب دینے کا ڈھنگ بھی اتنا شریر تھا،ایسا لگتا تھا کہ اگر اسکے ساتھ سوال جواب کرتے رہیں تو نہ جانے کیا کیا کہہ دے۔

انٹرویو سے باہر جانے کے بعد اسکی نظریں بہت دیر تک مجھے چبھتی

رہیں۔اب تو اسکو پروفیسری کا انٹرویو تھا۔اسکی شادی بھی ہو چکی تھی۔ بہت سالوں کے بعد آج وہ میرے سامنے آئی تھی۔شادی کر کے تو بدلی ضرور تھی مگر اسکی شرارت بھری نظریں بدلی نہیں تھیں۔اسکو اگر اب بھی موقعہ دیا جائے تو جانے کیا کہہ بیٹھے۔

مجھے تو اسکی شرارتوں سے تب بھی ڈر لگتا تھا۔میں بے چارہ شادی شدہ، گاؤں کا سیدھا سادہ سا آدمی،اور وہ شہر کی شریر شیرنی جیسی لڑکی۔۔۔آنکھیں اس کی بڑی بڑی تھیں۔ جب کوئی شرارت کرتی تو اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو زور دیکر اور بھی وا کرتی جس سے اسکی شرارت اور بھی دوگنی ہو جاتی۔

جب کالج میں پکنک جانا ہوتا تو وہ مجھے آنے کے لئے بڑی تاکید کرتی۔

''سر آپ آئیں گے نا۔۔۔آیئے گا ضرور۔۔۔سر۔۔۔پلیز''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔۔۔آئیں گے ضرور''

''سر مجھے معلوم ہے آپ سچ نہیں کہتے ہیں۔پلیز، پلیز ضرور آیئے۔ہم ویٹ کرینگے۔آپ کے بغیر کیسی پکنک سر''

''نہیں نہیں کیوں نہیں۔برابر آئیں گے۔''

مگر دوسرے دن جب پکنک جانا ہوتا تو میں رہ جاتا۔مجھے اندر ہی اندر اس لڑکی سے ایک عجیب سا ڈر لگتا تھا۔اسکی بے خوف مسکراہٹ،اسکی بے خوف باتیں۔اسکی نڈر آنکھیں مجھے اسکے ساتھ کہیں بھی جانے سے روک لیتی تھی۔۔۔یہی سوچ کر میں رہ جاتا کہ کہیں سب کے سامنے کچھ الٹا سیدھا کہہ نہ بیٹھے۔

میرے دل میں بھی کس چبھن کا احساس ہو رہا تھا۔اسکی آنکھیں ہر وقت میرا

پیچھا کرتیں تھیں۔اسکی مسکراہٹ ہر لحظہ میری آنکھوں میں بسی تھی۔۔۔مگر پھر بھی۔۔مجھے اسے ڈر لگ رہا تھا۔

پھر اس انٹرویو کے بعد میرے سامنے کبھی نہیں آئی؟۔پھر وہ کہاں گئی، کیا کرتی ہے؟ مجھے کچھ نہیں معلوم۔میں اس کے بارے میں کسی سے معلوم بھی نہیں کر سکتا ہوں۔کہاں ہے اب مجھے کچھ خبر نہیں۔

مگر وہ آنکھیں۔۔۔وہ بے خوف آنکھیں۔۔۔آج بھی میرے سامنے آتی ہیں۔۔میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو آج بھی میں اسے اپنے قریب ہنستے ہوئے پاتا ہوں۔۔میں تنہائی میں اسکے ساتھ ہزاروں باتیں کرتا ہوں مگر۔۔

تب میری جرأت کبھی نہ بن پڑی کہ میں اس کے ساتھ دو پل بات بھی کرتا۔میں نے بھی دل ہی دل میں اسے بہت محبت کی ہے۔مگر اپنی محبت کو کبھی بھی اس پر عیاں ہونے نہیں دیا۔اس کی محبت کا جواب اگر میں نے بھی محبت سے دیا ہوتا۔۔۔کاش؟؟؟

بے خوف آنکھیں لئے۔۔۔

نڈر مسکراہٹ لئے۔۔۔۔۔

وہ آج بھی میرے سامنے کھڑی ہے۔اور مسکرا رہی ہے۔

☆☆☆

۱۶

سیمنار

بڑے جوش و خروش سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہال میں طالب علموں کو بٹھا رہے تھے۔ دونوں ٹیچر بڑی محنت سے لڑکوں سے کہہ رہے تھے۔

"آج منسٹر صاحب آ رہے ہیں، آپ سیٹوں پر بیٹھ جاؤ۔ وہ آتے ہی ہونگے"۔

بالکل شور مت مچانا، آرام سے بیٹھے رہو۔

"جب منسٹر صاحب اور دوسرے مہمان آ جائیں تو کھڑا ہو جانا اور تالیاں بجانا"

اور لڑکے بھی بڑی خوشی خوشی ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک لڑکے نے

دوسرے سے پوچھا

"ہال کے اندر کیا ہو رہا ہے"۔

بدھو تمہیں نہیں معلوم۔ یہ ہفتہ ماحولیات کا ہے نا۔ منسٹر صاحب آر

ماحولیات پر لیکچر دینا ہوگا، میں نہیں جاؤں گا۔

پیچھا کرتیں تھیں۔اسکی مسکراہٹ ہر لحظہ میری آنکھوں میں بسی تھی۔۔۔مگر پھر بھی۔۔۔مجھے اسے ڈر لگ رہاتھا۔

پھراس انٹرویو کے بعد میرے سامنے کبھی نہیں آئی؟۔پھروہ کہاں گئی، کیا کرتی ہے؟ مجھے کچھ نہیں معلوم۔میں اس کے بارے میں کسی سے معلوم بھی نہیں کرسکتا ہوں۔کہاں ہے اب مجھے کچھ خبرنہیں۔

مگروہ آنکھیں۔۔۔وہ بے خوف آنکھیں۔۔۔آج بھی میرے سامنے آتی ہیں۔۔میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو آج بھی میں اسے اپنے قریب ہنستے ہوئے پاتا ہوں۔۔میں تنہائی میں اسکے ساتھ ہزاروں باتیں کرتا ہوں مگر۔۔

تب میری جرأت کبھی نہ بن پڑی کہ میں اس کے ساتھ دو پل بات بھی کرتا۔میں نے بھی دل ہی دل میں اسے بہت محبت کی ہے۔مگر اپنی محبت کو کبھی بھی اس پر عیاں ہونے نہیں دیا۔اس کی محبت کا جواب اگر میں نے بھی محبت سے دیا ہوتا۔۔۔کاش؟؟؟

بے خوف آنکھیں لئے۔۔۔

نڈر مسکراہٹ لئے۔۔۔۔۔۔

وہ آج بھی میرے سامنے کھڑی ہے۔اور مسکرا رہی ہے۔

☆☆☆

۱۶

سیمنار

بڑے جوش وخروش سے تیاریاں ہو رہیں تھیں۔ ہال میں طالب علموں کو

بٹھا رہے تھے۔ دونوں ٹیچر بڑی محنت سے لڑکوں سے کہہ رہے تھے۔

"آج منسٹر صاحب آرہے ہیں، آپ سیٹوں پر بیٹھ جاؤ۔ وہ آتے ہی ہونگے"۔

بالکل شور مت مچانا، آرام سے بیٹھے رہو۔

"جب منسٹر صاحب اور دوسرے مہمان آجائیں تو کھڑا ہو جانا اور تالیاں بجانا"

اور لڑکے بھی بڑی خوش خوشی ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک لڑکے نے

دوسرے سے پوچھا

"ہال کے اندر کیا ہو رہا ہے"۔

بدھو تمہیں نہیں معلوم۔ یہ ہفتہ ماحولیات کا ہے نا۔ منسٹر صاحب آرہے ہیں۔ انہیں

ماحولیات پر لیکچر دینا ہوگا، میں نہیں جاؤں گا۔

کب آرہے ہیں؟ کیا آج کلاسیں نہیں ہونگی۔؟

وہ تو ابھی گیارہ بجے آرہے ہیں۔

چلو نا، پروگرام ختم ہوتے ہی کلاسوں میں جائیں گے۔۔۔"

ہال کچھا کچھ بھر گیا۔ہال کی بالکونی بھی بھر گئی۔ابھی دس بج رہے تھے۔ طالب علموں سے کہا گیا تھا کہ وہ دس بجے ہال میں بیٹھ جائیں۔زعفرانی قہوہ اُبلنے لگا۔پیالیں اور پلیٹیں سجی ہوئی تھیں۔پیالوں میں بادام کی باریک کٹی ہوئی گریاں انتظار کر رہی تھیں کہ کب انکے اوپر قہوہ ڈالا جائے اور قہوہ کے ذایقہ میں چار چاند لگائیں۔ایک چھوٹی سی ٹرے پر گلدستے سجے ہوئے تھے۔تازہ تازہ پھولوں سے بنے ہوئے گلدستے اپنا رنگ اور خوشبو بکھیر رہے تھے۔سب سے بڑا گلدستہ منسٹر صاحب کے لئے اور چھوٹے چھوٹے گلدستے تعلیم اور جنگلات کے ڈائریکٹروں کے لئے رکھے گئے تھے۔ان صاحب کے لئے ہال کی آگے کے دو قطار خالی رکھے گئے تھے۔جن میں صوفے سجائے گئے تھے۔ہال کا سٹیج بھی شاندار لگ رہا تھا۔سٹیج پر اخروٹ کی لکڑی کی آٹھ شاندار کرسیاں سجائی گئی تھی اور ایک طرف سے اخروٹ کی لکڑی کا ایک ڈائس سجا کر رکھا گیا تھا۔ہر طرف بجلی کے قمقمے اجالا کر رہے تھے۔اور بجلی کے پنکھے ہر طرف سے چل رہے تھے۔یہ اور بات ہے کہ ہوا نہ ہونے کے برابر چل رہی تھی۔سٹیج کی سامنے کی دیوار پر ایک سکرین لگا ہوا تھا جس پر LCD کے ذریعے لکھاوٹ چل رہی تھی۔جس کے background میں قدرت کے مناظر کی تصویر تھی۔اور لکھاوٹ کچھ اسطرح تھی:

A SEMINAR ON "OUR ENVIRONMENT "

کچھ بچے سٹیج پر ڈرامہ کی ریہرسل کر رہے تھے۔ اور کچھ بچے ماحولیات کے موضوع پر گانا تیار کر رہے تھے۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ تمام ٹیچنگ اور نان ٹیچنگ سٹاف اس گہما گہمی کے حصہ دار تھے۔ خاکروب بھی تو اپنے حصے کا کام کر رہے تھے۔ ہر طرف سے گندگی اور کوڑا کرکٹ اٹھا اٹھا کر بڑے بڑے بالٹینوں میں جن کے اوپر ''مجھے استعمال کرو'' لکھا تھا ڈال رہے تھے۔ کیونکہ ماحولیات کا منسٹر آرہا تھا اور ہر طرف سے صاف شفاف ماحول نظر آنا چاہیئے۔ مسز کرشنا بار بار ہال کا دروازہ کھول کر ہال میں بیٹھے طالب علموں کو خاموشی سے بیٹھنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ بچوں میں بے قراری بڑھنے لگی تھی۔ ایک بچے نے پوچھا۔

''میڈم منسٹر صاحب کب آئیں گے۔ آپ نے تو کہا تھا دس بجے آئینگے۔ اب تو گیارہ بھی بج گئے۔''

میڈم نے غصے سے کہا۔ ''چلو چلو چپ کر کے بیٹھو، بس ابھی آتے ہونگے۔''

دوسرے بچے نے کہا۔

''میڈم میں باہر جاؤں گا۔ مجھے پیاس لگی ہے۔''

میڈم نے دروازہ زور سے بند کیا اور باہر چلی آئی۔

گیارہ بج کر پندرہ منٹ بھی ہوئے مگر مہمان خصوصی ابھی تک نہیں آئے۔

طالب علموں اور استادوں میں بے اطمینانی اور اضطراب بڑھتا گیا۔

ساڑھے گیارہ بھی بج گئے اور جناب عالی کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں تھا۔ بچے کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے۔

"میڈم ہمیں بھوک لگی۔ہمیں جانے دیجیے۔ہم کچھ کھائیں گے۔منسٹر صاحب اب نہیں آئیں گے۔"

"بکواس بند کرو، اور خاموشی سے بیٹھے رہو۔"

خدا خدا کر کے بارہ بج گئے اور گاڑیوں کی ہارن ہارن سے معلوم ہوگیا کہ جناب آگئے۔بچوں کی جان میں جان آئی۔سب بچے کھڑے ہوگئے۔منسٹر صاحب نے آتے ہی اپنی کرسی سنبھالی ۔پروگرام شروع ہوگیا۔بچوں کا ترانہ، ماحولیات پر گانا، ڈرامہ، اور آہستہ آہستہ ایک ایک پروگرام چلتا گیا اور وقت نکلتا گیا۔بچوں میں سٹرفکیٹ بانٹے گئے اور یوں پروگرام کا اختتام کیا گیا۔

مہمانوں کے سامنے قہوہ اور کیک رکھا گیا۔اور بچے صبح دس بجے سے بیٹھے قہوے اور کیک کا نظارہ کر رہے تھے۔

ایک بچے نے جرأت کر کے کہا۔میڈم کیا ہمیں بھی کچھ کھانے کو ملے گا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں، آپ کے لئے بھی refreshment آرہا ہے۔

دن کے دو بجنے لگے تو سٹاف میں بے چینی اور بڑھ گئی۔بچوں میں بے چینی پہلے سے تھی۔اب کے مہمانوں نے جو مائک پکڑ لیا، تو چھوڑنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔مسز کرشنا اس وجہ سے پریشان تھی کہ دیر ہوگئی اب مہمانوں کے لئے لنچ کا انتظام ہونا چاہیئے۔۔۔اور اب تو بچوں کے لئے بھی کچھ ہونا چاہیئے۔

لنچ کا انتظام کرتے کرتے اور تقریریں سنتے سنتے چار بج گئے۔ بچے بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو چکے تھے۔ اور بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میڈم وحیدہ نے سختی سے منع کیا تھا کہ دروازہ نہ کھولا جائے۔

''مسز کرشنا، اگر بچے بھاگ گئے؟ یہ تو منسٹر صاحب کی انسلٹ ہے کیونکہ وہ تقریر کر رہے ہیں۔

''بھاگیں گے نہیں تو کیا کریں گے؟ ہم بھی بچے والے ہیں۔'' ایک ٹیچر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

مجھے تو ان بچوں کے لئے بہت بُرا لگ رہا ہے۔ صبح کے بیٹھے ہیں ان کے صبر کی داد دینی چاہیئے۔ بچارے بچے۔۔

اتنے میں کالج کے دو ورکر جوس کے دو ڈبے لیکر آئے۔ اور مسز کرشنا سے کہا۔

''میڈم یہ لیجیئے جوس کے دو کریٹ۔۔۔۔ بچوں کے لئے۔۔۔ اور لنچ۔۔۔ مہمانوں اور۔۔۔۔ سٹاف کے لئے۔۔۔۔۔'' کہاں رکھدوں۔

بچوں میں جوس بانٹا گیا۔ انہوں نے جوس پی لیا اور بھاگ گئے۔

جوس کے ڈبے Disposible cups& plates جس میں مہمانوں نے قہوہ اور کیک کھایا تھا، اور وہ ڈبے جن میں ان کو لئے لنچ آیا تھا سب ہال میں بکھرے پڑے تھے اور environment پر زور سے قہقہ لگا رہے تھے۔

۱۷

اولاد

زہرہ خانم کے دل میں زبردست تذبذب تھا۔وہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اسکی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ بار باراس کا حلق خشک ہورہا تھا۔اوروہ بار بار پانی کا ایک گھونٹ اپنے حلق سے اتار رہی تھی۔ پھرایک بار اٹھ کر کھڑکی کھول دیتی۔ ادھرادھر دیکھتی مگر پھر کھڑکی کے کواڑ بند کر دیتی۔ بیڈ پر آکر لیٹ جاتی۔ پھر واپس اٹھ جاتی۔کبھی اپنے دل پر ہاتھ رکھتی، کبھی دماغ پر۔

زہرہ خانم کی شادی ملک عامر کے ساتھ ہوئی تھی۔ جواپنے زمانے کا رئیس تھا۔اس کا گھرایک بڑی سی کوٹھی تھی۔ جومہاراجوں کے زمانے میں بنائی گئی تھی۔اس کا ایک ایک کمرہ بڑے ہال کی مانند تھا۔جس کے ہر کمرے کے ایک کونے میں آتش دان تھا۔ ہر کمرے کے ساتھ ایک نہانے کا کمرہ منسلک تھا۔جس آجکل زمانے کے چیزوں سے لیس تھا۔ ہر کمرے کی سجاوٹ مہاراجوں جیسی ہی تھی۔لگتا تھا کہ راجہ مہاراجے ابھی بھی یہاں رہتے ہیں۔

اس نے یہ کوٹھی تب خریدی تھی جب مہاروں کا کوئی رشتہ دار اسمیں رہتا تھااور اب پنجاب بھا گنا چاہتا تھا۔آج کی قیمت کے حساب سے بہت معمولی سی رقم دیکر یہ کوٹھی اس کے ہاتھ لگی تھی۔کچھ بہت اچھی اچھی چیزیں وہ کوٹھی میں ہی چھوڑ گئے تھے۔

ملک عامر ایک بہت ہی خوش مزاج اور خوبرو نوجوان تھا۔اس نے اپنے بیوی زہرہ خانم کو گھر کی ملکہ ہی بنایا تھا۔کپڑے ،لتے ،زیور،ساڑیاں ،جوتے الماریوں کی الماریاں بھری پڑی تھیں۔کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ایک چیز لانے جاتے تو دس لیکر آتے۔

مگر ایک خوشی جو ہر عورت اپنے شوہر کو دیتی ہے وہ خوشی زہرہ خانم اپنے شوہر کو نہ دے سکی۔اسکی کھوکھ بچے سے خالی تھی ۔اس بات کے لئے ملک عامر اندر ہی اندر بہت پریشان اور اداس رہنے لگا تھا۔زہرہ خانم تو اس سے بھی زیادہ پریشان تھی مگر وہ اپنی زبان پر یہ بات جانے کیوں لا ہی نہیں سکتی تھی۔

ملک عامر کی دو بہنیں تھیں اور دونوں شادی شدہ۔وہ اکثر اس کو سمجھاتی رہتی تھیں مگر ملک عامر ان کی ایک بات بھی نہیں سنتا تھااور ان کی ہر بات کوان سُنی کر دیتا تھا۔مگر ایک دن تو باجی نے کھل کر بات بتا ہی دی۔

”عامر۔اب تمہاری شادی کو بارہ سال ہوئے۔ہمیں لگتا ہے کہ اب آپ کو دوسری شادی کرنی چاہیئے۔“

”باجی یہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔میں تو زہرہ کے بغیر جینے کی سوچ بھی نہیں سکتا ہوں۔وہ تو میری زندگی ہے اور زندگی کا مقصد۔“

"مگر میرے بھائی! زندگی آگے بھی تو بڑھنی چاہئے۔تمہاری زندگی تو رُکی ہوئی ہے۔"

"کیوں باجی؟ کیا جن کی کوئی اولاد نہیں ہوتی۔وہ جینا چھوڑ دیتے ہیں۔"

"نہیں میرے بھائی۔میں جینے کے لئے ہی تو تمہیں کہہ رہی ہوں۔انسان تو اولاد کے لئے جیتا ہے۔اولاد نہ ہو تو جینے کا کیا مزہ۔کچھ بھی ہو میں تو تمہاری دوسری شادی کر کے ہی رہوں گی۔"

اسی دن سے بہنیں اپنے بھائی کے لئے رشتے کی تلاش میں لگ گیئں۔زہرہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔یہ سارا معاملہ راز داری میں ہی ہو رہا تھا۔یہاں تک کہ ایک دن صبح ہی صبح عامر کی دونوں بہنیں زہرہ خانم کے پاس آیئں اور کہنے لگیں۔

"بھابھی سنایئے کیسی ہیں۔"

کیا بات ہے دیدی آج صبح ہی صبح؟

بھابھی ہم چاہتے ہیں کہ اب عامر بھائی کی زندگی بھی کسی کنارے لگے۔

کیا مطلب۔؟ میں تو کچھ سمجھی بھی نہیں۔

"بھابھی۔ہم چاہتے ہیں کہ بھائی کی دوسری شادی کر دی جائے۔۔میں آپ کو صلح دینا چاہتی ہوں کہ پلیز بھابھی بھائی کی زندگی میں انصاف کر لو۔؟"

"کیسا انصاف چھوٹی؟ جو تم کہنا چاہتی ہو صاف صاف کہو۔"

"بھابھی ہمارے رشتے میں کسی لڑکی کا رشتہ بھائی کے لئے آ رہا ہے۔" دوسری بہن نے کہا۔

''بھائی نے آپ کے ساتھ کتنے سالوں تک وفا کی ہے۔اب وفا کرنے کی باری آپ کی ہے۔''

''رشتہ،وفا،میری باری،؟ کس کی شادی؟ کس کا رشتہ؟'' مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے۔کُھل کر بتاؤ تم لوگ کہنا کیا چاہتے ہو۔''؟

''بھابھی ہم چاہتے۔۔۔۔ہیں۔۔۔۔کہ۔۔۔بھائی کا دوسرا نکاح کر لیں۔تاکہ ان کا بھی کوئی نام لیوا ہو جائے۔''

زہرہ خانم کے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی۔اور سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔اس نے حیرانی اور پشیمانی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ پوچھا۔

''نکاح؟۔۔۔عامر کی۔۔۔عامر کی دوسری شادی؟۔۔۔

اسکی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''ہاں بھابھی شادی۔۔۔مگر وہ آپ کو تھوڑی نا چھوڑ دیں گے۔۔۔آپ تو اسکی ملکہ ہو۔۔۔اور دوسری بیوی۔۔۔آئے گی تو۔۔۔وہ آپ کی بھی خدمت کرے گی۔۔۔آپ اجازت دے دو۔۔۔آپ اسکو خود لاؤ گی۔۔۔آپ ہی اسکی شادی بھی کرو گی۔۔۔لڑکی بھی دیکھو گی۔۔۔اور اسکے بچے آپ ہی کے بچے تو کہلائیں گے۔پلیز بھابھی۔پلیز مان جایئے۔''

زہرہ شش و پنج میں پڑ گئی۔کہنے لگی۔''مجھے سوچنے کا موقعہ تو دے دو۔۔آپ یہ سب بچے کے لئے کر رہے ہونا۔۔۔میں نے انہیں کتنی بار سمجھایا تھا کہ ہم بچہ adopt کر لیں گے۔اب میں ہوگئی نا دھوبی کا کُتا'' یہ کہتے کہتے اسکی آنکھوں سے آنسو باہر

چھلک پڑے۔ مگر وہ کہتی رہی۔

"مجھے تو کہتے تھے ہمیں بچے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔اور آج دیکھو۔۔۔۔ کہتے تھے تم ہوتو میری ساری دنیا ہو، تم ہو تو مجھے بچہ نہیں چاہیئے۔۔۔اور آج۔۔۔ آج بچے کے لئے مجھے۔۔۔۔چھوڑ دیں گے"۔زہرہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔

چھوٹی بہن کہنے لگی۔ "بھابھی وہ تو آج بھی نہیں مانتے ہیں۔مگر ہم چاہتے ہی کہ بھائی کا کوئی وارث ہو، کوئی نام لیوا ہو۔۔ بھابھی پلیز۔۔۔بھائی نے بارہ سال تک بچے کا انتظار کیا۔۔"

آپ مانو یا نہ مانو ہم لڑکی کو دیکھنے جارہے ہیں۔"

زہرہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی کہا۔ میں عامر سے بات کرلوں گی۔

وہ سارادن سوچتی رہی کہ عامر سے کیا بات کرے اور کیا نہ کرے۔وہ بے قراری کے عالم میں تھی۔

آخر کار دل پر صبر کا پتھر رکھ کر ملک عامر کے ساتھ بات ہوئی تو ملک عامر نے بھی زہرہ سے اپنی بات منوا ہی لی۔ بہنوں کے بہکاوے میں آکر وہ اپنے دل میں ایک نئی خواہش کا بیج بو چکا تھا۔ایک نئی خواہش کو جگا ہی دیا۔ بجھتے چراغ کی لو تیز ہوتی ہوئی اس کو بھی دکھائی دی۔اسے لگا کہ شاید میری قسمت میں اولاد کا سکھ لکھا ہو اور وہ دوسری بیوی کی کھوکھ سے ہو۔

زہرہ خانم کو اس بات پر راضی کرلیا گیا کہ ایک سونے کا ہار بنوا کر وہ بھی ان کے ساتھ لڑکی (اپنی سوتن) کو دیکھنے اور پسند کرنے جائے۔۔۔اسکو پسند کیا

گیا۔۔اور شادی کی تاریخ پکی ہوگئی۔

لڑکی ملک عامر کے آدھے عمر کی تھی۔مگر لڑکی کا باپ شاید اس لئے راضی ہو گیا کیونکہ ملک عامر کے پاس کافی مال و دولت کا ذخیرہ تھا۔اور اسکا وارث ابھی تک کوئی نہیں تھی۔اور اسکی بیٹی دو سال سے طلاق شدہ تھی۔۔۔اب دوسری شادی ہو گئی۔

زہرہ خانم کو ملک کی بہنوں نے اپنا کمرہ سجانے پر آمادہ کیا۔تاکہ نئی دلہن اس کمرے میں جا کر رہے۔زہرہ خانم نے اپنا کمرہ کیا چھوڑ دیا بلکہ اس کو اپنے کمرے سے نکال دیا گیا۔ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں شفٹ کیا۔اور دلہن کو اپنے کمرے میں لے گئی اور اسکو پلنگ پر بٹھا دیا۔جب عامر کمرے میں داخل ہوا۔۔تو ذرا سا رُک گیا۔۔۔پھر ۔۔۔اسنے اندر سے دروازہ بند کر دیا۔پہلی بار زہرہ کو کمرے سے باہر ہی چھوڑ دیا۔۔۔زہرہ کو ایسا لگا جیسے اسکے سینے کے کواڑ کسی نے اس پر بند کر دیئے۔

دلہن کو امید ہوئی تو گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔سب کہہ رہے تھے۔"دیکھا یہ اصل میں بھابھی میں ہی کمزوری تھی۔"

زہرہ کے دل پر لوگ تیروں پر تیر برسا رہے تھے۔اور وہ ان کو چپ چاپ سہہ رہی تھی۔۔آہستہ آہستہ گھر کی مالکن۔۔۔نوکرانی بن گئی۔

اس کی خوبصورتی اب ڈھلتے سورج کی طرح ہو چکی تھی۔ملک عامر اب اسکی طرف بہت کم دیکھتا تھا۔زہرہ پر اب گھر کا سارا بوجھ پڑ چکا تھا۔کھانا بنانا، گھر دیکھنا، صاف

صفائی سب اسکے ذمے تھی۔اب اس کو دن رات کام کی مصروفیت تھی اور بس کسی اور چیز کی طرف فرصت ہی نہیں تھی۔اس نے میکے کا دروازہ بہت دنوں سے دیکھا ہی نہیں تھا۔

اور اسکی سوتن

اس کو پہلے ایک بیٹا ہوا، پھر دوسرا بیٹا۔۔۔۔اور پھر تیسرا۔

تین سالوں میں تین بیٹے۔۔

اوہ خدایا۔۔۔

کس قدر دل گرفتہ ہو چکی تھی زہرہ۔

کتنی غمگین۔۔۔۔رہتی تھی۔

اس کی وجہ،سوتن کے بیٹے نہیں گھر والوں کا سلوک تھا۔ملک عامر نئی بیوی کے نخروں کو ہی دیکھتا رہتا تھا۔اسکی ہر بات پرواری جاتا۔اپنے بچوں کو لاڈ کرتا۔نئی بیوی جو کہتی وہ کرتا۔روز گھومنے پھرنے جاتے۔کانتی کباب ان کو کھلاتا۔مگر زہرہ کے لئے کوئی فکر کرنے والا بھی نہیں تھا۔اس کا شوہر جو اسے ملکہ کی طرح رکھتا تھا بھی اس کو بھول چکا تھا۔اب زہرہ کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گھر میں زائد ہے۔ملک عامر جس کے ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ نہیں ہوتی تھی وہ اب کھلکھلا کے ہنستا تھا۔

ایک دن ملک عامر گھر آیا تو بہت خوش تھا۔اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی نئی بیوی اور بچوں سے کہا۔

”نائلا خانم چلیئے تیار ہو جائیے اور بچوں کو بھی تیار کیجئے۔آج ہم سب گھومنے جائیں

گے۔وہاں سے ہی ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔خوب مزے کریں گے۔چلئے جلدی کیجئے۔“

زہرہ ان کو دیکھ رہی تھی۔دل میں سوچ رہی تھی۔

”کیا وہ اب اس قابل بھی نہیں تھی کہ اس کو بھی پکنک پر لیجایا جائے۔اسی کو کہتے ہیں جگر جگر است ودگر دگر است۔

بچے تیار ہو گئے۔نئے نئے کپڑے پہنے۔اسکی نئی بیوی بھی تیار ہوگئی۔ملک عامر نے گاڑی نکالی۔اور چل دئے۔ابھی گھر سے نکلے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ راستے میں گاڑی کسی ٹرک کے ساتھ ٹکرائی اور بچے۔۔۔تینوں بچے ۔۔۔ایک ساتھ۔۔۔۔۔؟؟؟

۱۸

بے رُخی

یونیورسٹی کے کمپونڈ میں جونہی میری گاڑی رُکی تو میری نظر اس پر پڑی۔ ہلکے نیلے رنگ کے سوٹ میں غضب ڈھا رہی تھی۔اور اس کے اوپر نیلے رنگ کا سکارف سر پر لیا ہوا تھا اور ساتھ میں نیوی بلیو رنگ کی کشمیری شال ۔جسکے بوڈر پر کشمیری سوزنی کام کیا ہوا تھا۔میں اسکی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔وہ کسی کے ساتھ محو گفتگو تھی۔مگر ایک نظر اسکی بھی مجھ پر پڑی تھی۔شاید اس نے مجھے نظر انداز کیا۔اور ہال کے اندر چلی گئی۔میں حیران ہوگیا۔ایسا میری زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے مجھے دیکھا اور اَن دیکھا کر دیا۔وہ تو مجھے دیکھتے ہی میرے قریب آتی تھی۔اور میرے ساتھ بات کرنے کے بہانے تراشتی تھی۔کبھی اس بہانے سامنے سے گذرتی تھی اور کبھی اس بہانے۔مگر آج۔۔۔۔یہ کیا بات ہوگئی۔۔۔؟

مریم کے اس رویے سے میں بھی سوچنے لگا کہ کیا بات ہوگئی۔آج مریم میں یہ بدلاؤ کیوں؟ کہیں آج۔۔۔نہیں۔یہ تو پچھلے دو سال سے مجھے بس دیکھتی ہی رہتی تھی۔۔۔اور بس۔کبھی موقعہ پا کر بات کرلیتی تھی۔۔۔مگر

آج یہ بے رخی کس لئے؟

یہ انجانہ پن کیوں؟

شاید میں اسی لائق ہوں۔ میں نے اسکے ساتھ کب کونسا اچھا برتاؤ کیا۔؟

کب کبھی اچھا سلوک کیا؟

مریم میری شاگرد تھی۔ میں نے اسکو دو سال تک پڑھایا۔ پڑھانے کے ساتھ ساتھ میں نے اسکے دل میں محبت کا ایک ایسا بیج بویا جسکی آبیاری کبھی نہیں کی۔ میں نے اس کا خیال کبھی نہیں رکھا۔ یہ میرے سامنے روز آتی تھی۔ مجھ سے نظریں ملانے کی کوشش کرتی تھی۔ میں بھی اسکو اپنے پاس بٹھا کر اسکے ساتھ باتیں کرنا چاہتا تھا مگر۔۔۔

میں نے اسکو کھل کر بات کرنے کا موقعہ کبھی نہیں دیا۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں ہم دونوں کی محبت دنیا پر ظاہر ہو جائے تو ہماری محبت کو بدنامی کا داغ لگ جائے گا۔ جو میں نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ دنیا والے کہیں میرا مذاق نہ اڑائیں۔ کیونکہ میں اسکا استاد تھا۔ اگرچہ میں دو سال پہلے ہی پڑھانے آیا تھا مگر تھا تو میں اس کا استاد۔

کبھی کبھی میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کو قریب بلاتا تھا۔

”آؤ مریم بیٹھو“

”جی“

کہو کیسی ہو؟“

”جی اچھی ہوں“

مجھے معلوم ہے تم اچھی ہو اور بہت اچھی ہو۔“

''نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔۔'' وہ اپنی نظریں جھکا لیتی۔اور یہی ادا اسکی میرا دل موہ لیتی تھی۔

میں اپنے ڈیپارٹمنٹ صبح سویرے جاتا۔وہ مجھ سے بھی پہلے پہونچ چکی ہوتی۔اور آنکھوں سے کئی بار سلام کرتی اور میں بھی آنکھوں آنکھوں میں ہی جواب دیتا۔میں جب بھی اسکو اپنے قریب بلاتا۔وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کچھی چلی آتی۔

''مریم چلو کسی دن کہیں دور چلیں''

''کہاں؟''

''دنیا والوں سے دور''

''کیوں''

''ساتھ بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

''چلئے۔''

''کہاں جائیں گے''

''جہاں آپ کہیں''

مگر ایسا موقع کبھی آیا نہیں۔میں اسکے ساتھ کہیں گیا نہیں۔کسی باغ میں نہیں۔کسی جگہ نہیں۔کتنی باتیں جو میرے دل میں تھیں میں نے اسے کبھی کہی نہیں۔اور اسکے دل میں بھی کتنی باتیں ہونگی جو اسنے بھی کبھی نہیں کہی۔

مگر اس نے میرے سامنے گزرنے، میرے قریب بیٹھنے کا موقع کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔وہ مریم جو روز میرے سامنے سے گذرنے کے بہانے ڈھونڈتی تھی آج

کیسی بے پروائی سے دور چلی گئی۔

آج میں بے قرار ہوا جا رہا ہوں؟

آج میں اسکے سامنے آنے کی کوئی ترکیب سوچ رہا ہوں۔

آج میں اسکے قریب جانے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہوں۔

اتنے میں مریم ہال سے باہر نکلی میں دروازے پر کھڑا تھا۔ میں نے دیکھتے ہی ٹوک دیا۔

''کیوں مریم؟ آج انداز بڑے نرالے ہیں۔''

''جی۔۔۔ شاید آپ کو ایسا لگ رہا ہے۔''

''کوئی تو بات ہے۔۔۔ آج تو میرے سامنے ٹکتی نہیں ہو۔''

''روز تو آپ لفٹ ہی نہیں دیتے ہیں۔ اسلئے۔۔۔''

''اسلئے۔۔۔ آپ نے سوچا کہ تم بھی مجھے لفٹ نہیں دو گی۔۔۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے مگر۔۔۔

''مگر کیا۔۔۔''

''اب آپ کے ساتھ نظر ملانا بھی گناہ ہے۔

''یہ کب سے گناہ ہو گیا۔۔۔ میں تو تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔۔ میں اس انتظار میں تھا کہ تم اپنی پڑھائی ختم کر لو۔۔۔''

''اب اسکی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ سر''

''کیوں کیا اب تم۔۔۔۔۔ کسی اور کی چاہت ہو۔''

"چاہت کس کی ہوں معلوم نہیں۔۔مگر۔۔کسی اور نے میرا ہاتھ , نگ لیا ہے۔"

"اور تم نے کیا سوچا ہے۔۔۔تم کیسے چپ رہ سکتی ہو۔" نبیل اب بے قرار ہو اٹھا۔باتیں کرتے کرتے یہ دونوں ہال کے دروازے سے بہت آگے نکل گئے تھے۔

"مریم تو تو بہت ہی نڈر اور بے باک لڑکی ہے۔تم اپنے ماں باپ سے کہتی کیوں نہیں۔۔"

"کیا کہوں"

"یہی کہ تم مجھ سے۔۔۔اور میں تم سے۔۔۔"

"یہ بات آج تک آپ نے کبھی کہی تو نہیں۔۔۔سر۔۔"

"مریم یہ تو بالکل غلط ہے"

"نہیں سر۔۔یہی صحیح ہے۔۔۔یہ تو میرا ہی دل دیوانہ اور پاگل تھا۔میرے بس میں نہیں تھا۔۔مگر میں نے اس دل کو قابو کرنا سیکھ لیا۔اب یہ کبھی آپ کے پیچھے پیچھے نہیں دوڑے گا۔۔۔"

"جایئے۔نبیل سر۔آپ کو اب مجھ سے ڈرنے کی اور چھپنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔میں اب کبھی بھی آپ کو تنگ نہیں کرونگی۔"

نبیل نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ مریم نے لمبے لمبے قدم اٹھائے اور وہاں سے چل پڑی۔اور نبیل تب تک اسے دیکھتا رہا جب تک وہ اسکی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی۔

☆☆☆

۱۹

فرشتہ

سارے شہر کو ظلمات نے گھیر رکھا تھا۔ نور اور روشنی دور دور تک لا پتہ تھی۔ ایک روشنی کی لو کہیں سے دکھائی پڑتی تھی مگر دوسرے ہی لمحے وہ بھی گم ہو جاتی تھی۔ آدم اور آدم زاد بستروں میں گھسے ہوئے تھے۔ سڑکیں بھی اندھیروں میں گم تھیں۔ کہیں سٹریٹ لائٹس نظر بھی نہیں آ رہیں تھیں اور گھروں میں بھی سناٹا چھا چکا تھا۔ بجلی کا نام و نشان تک کہیں دفن ہو چکا تھا۔ موم بتیوں نے ہی اپنی ظعیف روشنی سے گھروں کو روشن کر رکھا تھا مگر ان کی طاقت اتنی نہیں تھی کہ روشنی گھروں سے باہر جاتی۔

اب کے گھروں میں لالٹین اور تیل کے چراغ بھی تو نہیں تھے۔ جو پرانے زمانے میں گھروں کے زیور تھے۔ جب سے بجلی اور انوٹر invertor اور جنریٹرس generators نے زندگی میں دخل اندازی شروع کی تب سے آہستہ آہستہ ان سب چیزوں نے بھی اپنا راستہ لیا تھا۔ مگر یہ سب چیزیں بھی تب ہی چلتی

ہیں جب بجلی اور تیل اور پیٹرول ہو۔ان سب کا جنازہ نکل گیا تو روشنی بھی خود بخود دفن ہوگئی۔

آج۔۔۔تیسرا دن تھا کہ شہر وگاؤں میں زبردست برف باری ہو رہی تھی۔اور ایسی برف کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور نہ ہی کم ہونے کا۔چھت و بام، پیڑ پودے، در و دیواریں، بیل بوٹے، کھیت کھلیان، سڑکیں، دریا، ہر سمت سفید ہی سفید رنگ نظر آرہا تھا۔ایسا لگتا تھا کہ آنکھوں میں سفید موتیا نکل آیا ہے۔اگر روشنی نظر آرہی تھی وہ برف کی سفیدی سے تھی۔

باہر جانے کے سارے دروازے بھی بند پڑے تھے۔گھروں کے باغوں میں، آنگنوں میں، سڑکوں پر برف ہی برف تھی۔

رشید احمد جو بہت دنوں سے بیمار پڑا تھا نے گھر میں ایک ہنگامہ سا برپا کیا تھا کہ اس کو ہسپتال لے جایا جائے تا کہ وہاں اس کا علاج معالجہ ہو سکے۔اس کو جیسے ڈر لگ رہا تھا۔موت کا ڈر، زندگی سے ہار جانے کا ڈر، بنا علاج بنا دوائی مر جانے کا ڈر۔

گھر والوں نے بہترا سمجھایا کہ برف کی وجہ سے تمام سرکار اور غیر سرکار سوئی ہوئی ہے۔تمام راستے بند ہیں۔راستوں پر برف ہوگی جو ابھی کسی نے اٹھائی بھی نہیں ہوگی۔معلوم نہیں کہ ہسپتالوں میں کوئی ہوگا یا نہیں۔مگر رشید احمد تھا کہ اس نے کسی کی ایک نہ سنی۔وہ ایک ہی ٹانگ پر تھا۔

"میں تو ہسپتال جاؤں گا"

"مگر۔بابا آپ کس میں جائیں گے۔باہر نہ آمد و رفت کی کوئی سبیل ہے اور نہ گھر میں

کوئی گاڑی ہے اور نہ ہی باہر جانے کا راستہ۔" اس کی بیٹی نے اسے روکنا چاہا۔

"نہیں وحی۔ تو مجھے مت روک۔ جیسے ساری دنیا چلتی ہے ویسے میں بھی چلوں گا"

"آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ باہر تو سب برف ہی برف ہے اور وہ بھی دو فٹ سے زیادہ"

وحیدہ نے کسی طرح اپنے باپ کو منالیا اور وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔

ابھی گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ایسی دھوپ نکل آئی کہ سب حیران ہو گئے۔

سردی ایسی کہ دانت ٹھٹھر رہے تھے مگر دھوپ ایسی نکلی جیسے دھلی دھلی ہوا لگ رہی تھی۔ اب برف بھی پگھلنے لگی۔ اور ہر طرف سے پانی برسنے لگا۔ لگ رہا تھا کہ در و دیواریں سب ٹھاٹھیں مار مار کے رو رہی ہیں۔ پل بھر میں ساری سڑکیں پانی پانی ہو گئیں۔ اور ہر طرف سے دریاؤں اور جھیلوں کا سا منظر نظر آنے لگا۔ گھروں میں سڑکوں پر ہر طرف آب در آب ہو چکا تھا۔

دھوپ نکلی بھی نہ تھی کہ رشید احمد نے پھر کہنا شروع کیا۔

"اب تو دھوپ بھی نکل آئی۔ میں ہسپتال جاؤں گا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر مجھے دیکھے گا تو دوائی دے گا اور میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ ورنہ گھر میں بنا علاج کے ہی سڑ جاؤں گا۔"

اس نے کسی کی ایک نہ سُنی۔ گھر والے اس کو کہتے رہے کہ ابھی باہر پانی ہے، آنے جانے کا راستہ نہیں ہے۔ مگر وہ غصہ سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

"کبھی کہتے ہو برف ہے۔ کبھی کہتے ہو پانی ہے۔ تم سب بیٹھو میں چلتا ہوں۔"

رشید صاحب جوتا پہن کر گھر سے پیدل چلنے لگے اور سب اسکے پیچھے دوڑنے

لگے۔گھر کے دروازے سے باہر نکل کر ہی اس کے دونوں پاؤں پانی میں ڈوب

گئے۔اوراسکے جوراب اور جوتے دونوں گیلے ہوگئے۔

رشید صاحب چلائے۔''ہماری سرکار کہاں ہے۔مجھے ہسپتال جانا ہے۔''

ایک بھلا آدمی اسی وقت گاڑی میں اس کے سامنے سے گذرا۔تو اس نے رشید

صاحب کواس حالت میں دیکھا تو پوچھا۔

''چاچا۔آپ کس طرف جارہے ہیں۔''

''بیٹا مجھے صدر ہسپتال جانا ہے۔اگر تم وہاں کی طرف سے جارہے ہو تو مجھے راستے

میں چھوڑ دینا۔

جب تک گھر والے اسکے پیچھے دوڑے رشید صاحب گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوچکے

تھے۔

اس بھلے آدمی نے رشید صاحب کو ہسپتال کے گیٹ کے نزدیک چھوڑ دیا اور خود دوسری

طرف نکل پڑا۔رشید صاحب ہسپتال کی سیڑیاں چڑھنے لگا۔

اسکے پاؤں سے''چرچر کی آواز آرہی تھی۔معلوم ہورہا تھا کہ اسکے جوتے میں پانی

ہے۔جس کی وجہ سے یہ اور بھی چڑچڑا ہوگیا۔ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتا

رہا۔آخرکار وہ کمرہ نمبر ۳۳ میں پہونچ گیا جہاں اسے کوئی ڈاکٹر ملتا۔

''مگر یہ کیا؟

اوہ خدایا۔دروازے پر تو تالا لگا ہوا ہے۔میں کتنی مشکل سے یہاں پہونچا ہوں۔

''نر ---س---ڈاکٹر---صاحب------کیا یہاں کوئی بھی

نہیں ہے۔'' رشید صاحب چلانے لگا۔

ارے سنو کیا یہاں کوئی نہیں ہے''

''بھائی صاحب ڈاکٹر صاحب کب تک آئیں گے۔''

یہ ایک ایک سے پوچھ رہا تھا مگر وہاں جتنے بھی لوگ تھے سب پریشان تھے۔ کہیں نرس تھی ڈاکٹر نہیں۔ کہیں ڈاکٹر تھا تو دوائی نہیں، تالا تھا تو چابی نہیں۔

سرکاری ہسپتال۔۔۔۔۔۔؟ یہاں تو کوئی نہیں۔۔۔سارا نظام جیسے درہم برہم۔۔۔۔جیسے زندگی اپاہج ہوگئی ہے۔۔۔۔کتنی مشکل؟ اب کیا کروں۔۔۔اب گھر ہی واپس جاتا مگر۔ جاؤں تو کیسے جاؤں۔۔۔۔۔۔؟؟؟

نہ ڈاکٹر ملا، نہ علاج ہوا۔ اب سردی کی وجہ سے وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے وہ ہسپتال کے گیٹ کی طرف چل پڑا۔ ابھی گیٹ کے پاس پہونچا بھی نہ تھا کہ وہی بھلا آدمی پھر ایک بار اسکے سامنے گاڑی لیکر کھڑا ہوا۔

''چاچا میں آپ کی کوئی مدد کروں۔۔۔آپ کہاں جارہے ہیں۔''

رشید صاحب نے ذرا سی گردن جھکائی۔ اس نے پہچان لیا۔

''تم تو وہی فرشتے ہو جو صبح مجھے ہسپتال لایا تھا۔ بیٹے اللہ تمہارا بھلا کرے۔ کیا اب تم مجھ کو گھر تک لے جا سکتے ہو۔''

بھلے آدمی نے گاڑی کی کھڑکی کھول دی اور آہستہ سے کہا ''زہے نصیب''

☆☆☆

۲۰

لخت جگر

سائرہ اتنی خوبصورت تھی کہ لوگ اس کو کتابی چہرہ کہتے تھے۔اسکی آنکھیں جھیل جیسی گہری، اسکے ہونٹ ہلکے گلابی، اسکی آنکھوں کی پُتلیاں اتنی لمبی لمبی جیسے ان کو مصنوعی طریقے سے سجایا گیا تھا۔اوراسکے گال کشمیری سیب کی طرح لال لال۔
زندگی میں اس نے کیا حاصل کیا تھا۔کچھ بھی نہیں۔پڑھ لکھ کے نوکری کے لئے باپ نے منع کیا۔شادی کرادی تو شوہر نے منع کیا۔کہا کہ ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے نوکری کی۔ہماری بہو بیٹیاں نوکری نہیں کرتیں۔اس کا کام یہی تھا کہ وہ سارا دن گھر کو دیکھے اوراس کی سجاوٹ کرے۔لے دے کے اسکی حاصل حیات دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔

وہ اپنے بیٹے دانش کو دن رات دیکھا کرتی۔سارا دن اس کے ناز اٹھاتی۔اس کی ہاں میں ہاں ملاتی،اس کی پسند کی چیزیں بناتی،اس کو خود اپنے ہاتھوں سے کھلاتی۔کبھی اس کے ساتھ کرکٹ کھیلتی،کبھی اس کے ساتھ دوڑ لگاتی اوراس سے ہار جاتی۔اوراپنے بیٹے کی جیت پر اتنی مسرت دکھاتی جس کا کوئی اندازہ ہی نہ

تھا۔ رات دن اس کو دیکھتی کہ وہ کتنا بڑا ہو گیا، کتنا لمبا ہو گیا۔

اس نے کبھی بیٹیوں کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ بیٹیاں تو خود ہی بڑی ہوتی ہیں۔ لڑکوں کو دنیا چلانی ہوتی ہے اور لڑکیوں کو گھر۔ لڑکیوں کو گھر گرہستی آنی چاہیئے اور لڑکوں کو دنیا کے سارے کام آنے چاہیئے۔ اور بلکہ بہنوں کو بھی بھائیوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔

دیکھتے دیکھتے اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ اسکی ماں کو خبر بھی نہیں ہوئی کب یہ بڑا ہو گیا اور کب جوان ہوا۔ اسکی نئی نئی داڑھی اسکے چہرے کو رونق بخش رہی تھی۔ ماں کا لاڈلا ہر وقت ماں کی نظروں کے سامنے رہتا۔ باپ کے کاروبار کی سمجھ بھی اسکو آنے لگی تھی۔ وہ ہمیشہ باپ کو کہتا تھا۔

''ابو اب آپ آرام کرلو، کام میں سنبھالوں گا۔'' اسکے ابو اسکو کہتے۔

''میری جان، پہلے بی اے تو کر لے۔ اسکے بعد میرا کاروبار سنبھال لینا۔ ابھی تو تم اس کام کے لئے بہت چھوٹے ہو۔''

مگر دانش تو جیسے سب کچھ سیکھ کر ہی آیا تھا۔ ہر کام کاج میں وہ استاد تھا۔ وہ جس چیز کو ہاتھ لگاتا وہ سونا ہو جاتی۔ ہر چیز میں منافع ہو جاتی تھی۔ گھر بھر میں خوشیوں کی برسات ہونے لگی تھی۔

جب سردیوں کا موسم ختم ہونے لگا تھا اور بہار بھی اپنی آمد کی تیاری میں لگ چکا تھا۔ درختوں نے بھی سبز لباس پہنے کی تیاری کر لی تھی۔ ہر طرف شگوفوں سے دل آرام و سکون حاصل کر رہا تھا۔ سورج بھی دگر گون نظر آنے لگا تھا۔ ماحول میں

سردیوں کی گھٹن کم ہورہی تھی اور گرمی کا احساس خوشی دے رہا تھا۔

ساجد دوڑتے دوڑتے گھر آیا تو اپنے جیکٹ کو باہر نکالا اور بیڈ کے اوپر پھینک دیا اور ماں کو آواز دی۔

''ماں مجھے زوروں کی بھوک لگی ہے جلدی سے کھانا دے دو۔''

ماں نے کہا ''میں تمہارے لئے مرغا پکا رہی ہوں۔ بس تیار ہونے ہی والا ہے۔''

''چلو میں دس منٹ میں آتا ہوں۔ تم تب تک کھانا پروس لینا''۔

''جلدی آنا پھر۔۔۔۔''

ساجد ''جی ماں'' کہہ کر چلا گیا۔ اور ماں کھانا بنانے میں لگ گئی۔

دس منٹ بھی گذر گئے، بیس منٹ، تیس منٹ اور گذرتے گذرتے پورا دن گذر گیا۔ مگر ساجد نہیں آیا۔

ماں کی ممتا پگلتے پگلتے پگلا گئی۔ آنکھوں سے اب اشک برسنا شروع ہو گیا۔ ادھر اودھر ڈھونڈا مگر کہیں اتا پتا نہی ملا۔ سب جگہ ڈھنڈورا پیٹا۔ سب محلے والوں سے پوچھا مگر کہیں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ نہ جانے اسے زمین نگل گئی یا آسمان اٹھا کے لے گیا۔

سائرہ کا حال بہت بُرا تھا۔ وہ ایک ایک سے کہہ رہی تھی ''ساجد نے مجھے کھانا پروسنے کو کہا اور خود چلا گیا۔ مگر کہاں چلا گیا مجھے نہیں معلوم۔ اب کہاں ڈھونڈوں اسے۔ کس کو پوچھوں اس کے بارے میں کہ کہا گیا۔''

اب تو اخباروں میں بھی اس کی خبریں آنے لگی کہ ایک نوجوان کئی دنوں سے لاپتہ ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ خبریں بھی آتی تھی کہ کہیں بے نام قبریں ہیں، کہیں نوجوانوں سے

جیلوں کو بھر دیا گیا ہے، کہیں لاشوں کی شناخت نہیں ہوتی، کتنی ہی خبریں روز تو ہوتی ہیں۔

''اوہ خدایا! کہیں ایسا نہ ہو کسی نے میرے بیٹے کو اٹھا لیا ہو۔ کہاں جا کر ڈھونڈوں میں اپنے لعل کو۔ کہاں جاؤں اسسے ڈھونڈنے کو۔''

اب تو وہ اپنے ہوش ہی کھو بیٹھی۔ اسے نہ کھانے پینے کا ہوش تھا اور نہ پہننے کا۔ اسکے ہوش میں ایک ہی بات تھی ساجد۔ ساجد۔ ساجد

ساجد کا باپ۔۔ وہ تو خود از ہوش ہی گیا تھا۔۔ وہ اپنی بیوی کو کیا سمجھاتا۔ وہ اپنی بیوی سے نظریں ہی ملا نہیں سکتا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ سائرہ کی جان اپنے بیٹے میں ہی اٹکی ہوئی ہے۔ اگر ساجد نہیں ملا تو سائرہ بھی نہیں بچ سکتی ہے۔ اس کی سانسیں تو اپنے بیٹے کی وجہ سے چلتی ہیں۔

سائرہ اپنے بیٹے کو گلیوں گلیوں ڈھونڈ رہی تھی۔ شام ہو گئی مگر جب اسکو کہیں نہ پایا تو وہ گھر کا راستہ بھول گئی۔ ساری رات گھر والے اور اسکی بیٹیاں اسکا انتظار کر رہی تھیں۔ مگر وہ نہیں آئی۔

آج قبرستان بہت ہی روشن تھا۔ وہاں کسی نے شمعیں جلائیں تھیں اور سارا قبرستان آج مہک رہا تھا۔ ہر طرف سے پھولوں کی چادریں پھیلائی گئیں تھیں۔ پھولوں کی مہک سے سارا قبرستان پھلواری بن گیا تھا۔

معلوم ہوا کہ سب بے نام قبروں پر سائرہ نے پھولوں کی چادریں چڑھائی تھی۔ ہر قبر پر اس نے لکھ دیا تھا۔ ''ساجد ''ساجد ''میر الخت جگر''

☆☆☆

۲۱

سفید خون

وہ ایک کمپنی میں مینیجنگ ڈائریکٹر ہو گیا۔اس نے خوب لکھائی پڑھائی کی تھی ۔اس کا نام نذیر احمد تھا۔اوراس کا بھائی فیاض احمد اس سے ایک سال سے چھوٹا تھا۔ نہ تو اس نے خوب پڑھائی کی اور نہ ہی کسی اچھے عہدے پر ہی فائز ہو گیا۔ان دونوں کی پرورش میں ماں باپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی ۔مگر فیاض احمد کا دل پڑھنے میں نہیں لگتا تھا۔اس وجہ سے اس نے اپنی تعلیم آدھے راستے ہی چھوڑ دی۔وہ کلرک بن گیا۔مگران دونوں بھائیوں میں بہت پیار تھا۔

نذیر احمد اچھے عہدے پر فائز تھا۔گھر والی بھی اچھی اور پڑھی لکھی مل گئی۔وہ کالج میں پڑھانے کا کام کرتی تھی یعنی پروفیسر تھی۔اور فیاض احمد کو بیوی بھی اپنی طرح کم پڑھی لکھی یعنی انڈر میٹرک مل گئی۔ جو گھر میں ہی رہتی تھی۔مگر ایک بات اسمیں بھی اچھی تھی کہ گھر سنبھالنے کافن اسکو بہت اچھے سے آتا تھا۔

ادھر فیاض احمد کے گھر میں ایک بیٹا ہوا اور نذیر احمد کے یہاں بھی بیٹا ہوا۔اور دونوں بھائیوں نے اپنے اپنے مقدور کے مطابق اپنے اپنے بچے کا مستقبل

سنوارنے کے جتن کیئے۔

نذیر احمد سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے راحیل کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کرے گا اور اسکو امریکا بھیجے گا۔تا کہ امریکہ میں نئ تعلیم سیکھ کے زندگی میں کچھ حاصل کرے گا۔اور زندگی میں خوشحالی کے ساتھ آگے بڑھے گا۔اس کے سامنے زندگی میں پیسہ کا بول بالا تھا۔پیسہ ہے تو زندگی کی خوشیاں ہیں۔پیسہ ہی انسان کو انسان بناتا ہے۔اس دنیا میں سب سے بڑا روپیہ ہے۔یہی سوچ کے اس نے اپنے بیٹے کو ڈاکٹری کروائی اور اسکو امریکہ بھیج دیا۔

ادھر فیاض احمد کا بیٹا بھی بڑا محنتی تھا۔وہ محنت مشقت کر کے پڑھتا بھی گیا اور زندگی کے مراحل طے کرتا گیا۔اسکو ڈاکٹری اور انجینرئ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

فیاض احمد نے جب دیکھا کہ نذیر احمد نے اپنے بیٹے کو امریکہ بھیج دیا۔اسکی بھی رال ٹپکنے لگی۔اسکا دل بھی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی اپنے بیٹے کو امریکہ بھیج دے۔وہ سوچ رہا تھا؛

”آجکل تو سارے ماں باپ اپنے بچوں کو باہر بھیج دیتے ہیں ایک میں ہوں کہ۔۔۔

”یا اللہ ڈالروں کی برسات میرے لئے بھی کردے۔تاکہ میں بھی اپنے بیٹے کو باہر کے دیش بھیج دوں۔“

سہیل نے اپنے باپ کو یہ کہتے سنا تو اسنے کہا۔”ابا آپ کو بھی یہ کونسی آرزو ہے۔کیا آپ مجھے امریکہ بھیج دینا چاہتے ہو۔“

کیوں نہیں میرے جگر کے ٹکڑے، میں بھی چاہتا ہوں کہ تو جس چیز کو چھوئے سونا ہو

جائے۔ کھانے کو تمہیں پلاؤ اور اور پینے کو شربت مل جائے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ تمہیں پہننے کو ریشم اور سونے کو ڈنلپ مل جائے۔ میری بھی تمنا ہے کہ میں تیرے لئے کچھ کروں۔۔۔"

بس بس ابّا زیادہ جذباتی مت ہو جایئے۔۔۔"

ابھی یہ سب باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سہیل کی امّی نے بھی دخل اندازی کی۔

"نہیں جی نہیں۔ میں اپنے بیٹے کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔ کم کھائیں گے غم نہیں کھائیں گے۔ (غم نہیں کریں گے)۔ سہیل تو میری آنکھوں کا نور، دل کا سرور ہے۔ اگر یہ چلا گیا میری تو آنکھیں ہی بے نور ہو جائیں گی۔ مرگ بر امریکا، ہمارا اپنا کشمیر زندہ باد۔ اور اصل بات یہ ہے کہ اب اپنے ملک میں تعلیم کی کوئی قدر و قیمت نہیں جو بیرون کشور ہے۔ مگر میں اپنے دل کو کس طرح سمجھاؤں جو اسکے بغیر بے قرار رہے گا۔

سہیل نے ماں کی بات سنی تو اسنے ایک دم کہا۔ "میری ماں تو کس بات کا غم کرتی ہے میں تجھے اکیلا کبھی نہیں چھوڑنے والا۔ میں نے اپنے دل میں یہ قصد کر لیا ہے کہ میں پڑھائی بھی یہاں ہی کروں گا اور نوکری بھی یہیں کروں گا۔ پگار زیادہ ملے یا کم۔ جتنا ملے گا اسی میں گذارا کر لیں گے۔ مگر اکھٹے رہیں گے۔" ماں کا دل یہ سن کر پسیج گیا اسنے دعا دی۔ "ماں تیرے صدقے، اسی کو کہتے ہیں اولادِ صالح۔ اللہ تیری عمر دراز کرے اور تیرے رزق میں وسعت کرے۔"

فیاض احمد اپنی گھر والی کی بات سُن کر حیران و پشیمان ہو گیا۔ بات تو اس نے سولہ آنے

سچ کہی تھی۔اگر وہ امریکہ چلا گیا تو ہمارا کیا ہوگا۔

سہیل نے IAS پاس کیا اور اسکو اپنے شہر کا ڈی سی بنایا گیا۔اسکے ماں باپ پھولے نہیں سماتے تھے۔انکو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ہمارے باغ میں بھی بہار آئی ہے۔اور پھول کھل گئے۔اس کی ماں کی آنکھوں سے آنسو اترے اور گال پر رک گئے۔اس نے دونوں ہاتھ اللہ کی بارگاہ میں شکرانہ کے طور اٹھائے۔

''یا اللہ کہاں سے لاؤں وہ زبان کہ تیرا شکر بجالاؤں۔میں نے جو مانگا تو نے وہی دیا۔لاکھ لاکھ شکر ہزار ہزار ثنا۔''

سہیل صبح شام اپنے ماں باپ کے پاس بیٹھتا اور ان کو ایک عجیب سی تسلّی ہو جاتی۔

وقت دوڑتا اور بھاگتا رہا مگر نذیر احمد کو امریکہ سے کوئی پیغام کوئی خاص خبر نہیں آتی تھی۔سارا دن راحیل کا باپ ہاتھ میں موبائیل لئے گھومتا رہتا مگر بے سود۔راحیل کمپنی کے کاموں میں ایسا الجھا تھا کہ آٹھ آٹھ دنوں گھر اور گھر والوں کی یاد بھی نہیں آتی تھی۔وہ کبھی کبھار فون پر صرف حال چال پوچھتا تھا۔

نذیر احمد جیسے اپنی زبان نگل گیا تھا۔وہ نہ کسی سے کچھ کہہ سکتا تھا اور نہ ہی کچھ بول سکتا تھا۔۔۔۔سہیل کی ترقی دیکھ دیکھ وہ اندر ہی اندر برف کی طرح پگل رہا تھا۔ایک دن اس نے راحیل کو فون لگایا اور کہا۔''راحیل اب تم واپس آجاؤ۔میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں۔تمہاری ماں کا بھی یہی حال ہے۔''

راحیل نے جواب دیا۔

''پاپا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔میں پھرڈاکٹر بجھواتا ہوں۔''

''کیا خبر؟ کیا بتاؤں''اسکے پاپا نے بھی مختصر سا جواب دیا۔راحیل نے اپنے دوست کوفون کر کے پاپا کو دیکھنے کی درخواست کی۔ڈاکٹر شہاب راحیل کے گھر گیا اور اسکے پاپا کو چیک اپ کیا۔اور کہا۔آپ بالکل ٹھیک ہیں۔میں راحیل سے خود ہی بات کروں گا۔ڈاکٹر کے ساتھ بات کرنے کے بعد راحیل نے گھر پر لیب ٹاپ کا انتظام کیا۔اور اسی پر اپنے ماں باپ کے ساتھ بات کی۔اور اسی وقت کہا۔کہ ان کا دل جب چاہے اسکے ساتھ بات کر سکتے ہیں اور اسکو دیکھ سکتے ہیں۔ماں باپ کو تسلی ہوئی۔

کچھ دنوں بعد جب نذیر احمد کی گھر والی نیند سے اٹھی اسنے دیکھا کہ نذیر احمد کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔اسنے چلا چلا کر تمام محلے والوں کو بلایا۔سہیل نے راحیل کو بھی فون کر کے حالات سے آگاہ کیا۔

''میرے دوست،اب آؤ گے واپس کہ نہیں''۔اس نے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا۔
مگر راحیل کی زبان جیسے گلے میں اٹک گئی۔کوئی جواب نہ بن پڑا۔۔۔اور ایک دن۔۔۔نذیر احمد نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی اور اپنی آنکھیں میچ لیں۔

فون کر کے لیب ٹاپ پاپا کے سامنے رکھوایا گیا۔راحیل نے اپنے باپ کو آخری بار دیکھ لیا۔اور بہت دیر تک دونوں ہاتھ جوڑے ہونٹوں کو ہلاتا رہا۔

☆☆☆

۲۲

روٹی

آج وہ سب بہت خوش تھے۔صبح سے ہی سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔انکے چہرے گلاب کی طرح کھلے ہوئے تھے۔اور آنکھیں مسکرا رہیں تھیں۔عورتیں، بچے بوڑھے جیسے ہر روز اسی دن کا انتظار کرتے تھے۔یہی دن تو تھا جب ان کو پیٹ بھر کر کھانا ملتا تھا۔اور صرف پیٹ بھر کر نہیں بلکہ طرح طرح کے مزے دار اور کئی قسم کے پکوان کھانے کو ملتے تھے۔کبھی مٹھائیاں اور کبھی پوریاں، کبھی حلوہ اور کبھی پلاؤ ملتا تھا۔

''ارے او جلدی کرو، اپنا کام جلدی سے نپٹاؤ اور چلتے بنو۔لوگ تو صبح سویرے سے آنا شروع کرتے ہیں۔اپنا اپنا لفافہ بھی لیتے جانا، اور کچھ پلیٹ بھی'' بوڑھی اماں نے سب کو چھکتے دیکھ کر آواز لگائی۔پھر اس کے بعد بولی۔

''بہو تم بھی آہستہ آہستہ چلتی چلو۔شاید تمہیں آج اچھا کھانا مل جائے تمہارے بچے کے لئے ضروری ہے اور تمہاری کمزوری بھی کچھ کم ہو جائے۔''

''ہاں ہاں نکل جاتی ہوں۔بس ذرا سا آرام کرلوں۔'' بہو نے جواب دیا۔

''آرام تو وہاں بھی کرنا ہے۔کوئی ٹاٹ کا ٹکڑا لیتی جانا تا کہ اسی پر بیٹھو گی۔''

''اماں کیا تو نہیں آئے گی۔۔۔آج تو خوب کمائی ہوتی ہے۔تم بھی گھر مت بیٹھنا۔۔۔آج کے دن ہی تو لوگ دل کھول کر دیتے ہیں۔''

سب گھر کے لوگ تیار ہو گئے۔سب نے اپنی اپنی ضرورت کی چیزیں لائی۔کسی نے لفافہ،کسی نے پلیٹ،کسی نے ٹاٹ کا ٹکڑا،کسی نے کوئی تھیلا،کسی نے اور کوئی چیز اٹھائی۔کوئی میلے کچیلے کپڑے پہن کے تیار ہے۔کسی نے لمبی قمیض پہنی تو شلوار ندارد،کسی بچے نے کپڑے ہی نہیں پہنے وہ ننگا گھومتا ہے۔ساری پلٹن نکل پڑی۔ دونوں بہوئیں اپنی اپنی گود میں بچوں کو اٹھا کر چل پڑیں۔اور باقی بچے دوڑ دوڑ کر گھر کے مردوں کے ساتھ نکل پڑے۔بوڑھوں نے اپنی کمبلیں بھی ساتھ اٹھائیں۔

ان سب کا گھر بار ہی لوگوں کے دیئے پر چلتا ہے۔ان کو کرنے کو نہ کوئی کام ہے اور نہ ہی کوئی نوکری اور نہ ہی کوئی کاروبار۔ہمہ وقت ہاتھ پھیلانا ہی ان کا کام ہے۔مگر اس کے بعد بھی ان کا پیٹ پورا نہیں پڑتا۔ہمہ تن پیر بابا کے در پر پہونچ گئے۔

یہ پیر بابا کی درگاہ ہے جو گاندی نگر کے دل میں واقع ہے۔لوگ ہر ویروار کو منت ماننے آتے ہیں۔اور اس دن یہاں لوگوں کا تانا بندھا ہوتا ہے۔صبح سویرے سے لوگ آنا شروع کرتے ہیں۔پیر بابا کی درگاہ پر حاضری دینے والوں میں طرح طرح کے لوگ آتے ہیں۔ہندو،مسلمان یا کوئی بھی مذہب کے لوگ۔ہر کوئی اپنی ضرورتیں لیکر آتے ہیں۔انہیں لگتا ہے کہ پیر بابا کے در پر حاضری دینے سے ان کی ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔کوئی وہاں کی دیواروں کو دھاگا باندھ کر چلا جاتا ہے اور

کوئی چادر چڑھا کے جاتا ہے۔اور مانگنے والوں کے لئے کچھ نہ کچھ لے جایا کرتے ہیں۔نقدی، کھانا، پینا، وغیرہ

سب نے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔پیر بابا کے دروازے سے شروع کر کے آگے آگے چلتے گئے اور بیٹھتے گئے۔اور اپنے سامنے کپڑے کا ایک ٹکڑا پھیلایا۔ابھی سب بیٹھے بھی نہ تھے کہ ایک عورت گاڑی سے اتری اور وہ گرم گرم پوریاں اور چنے لیکر آ گئی تھی۔جونہی اس نے چنے کا پتیلا اور پوریاں کھولیں اور ایک ایک کو دینے لگی، بوڑھی اماں نے دیکھ کر ہی جٹ سے آواز لگائی۔

''اپنی اپنی پلیٹ نکالو اور چنے پوری لے لو۔ابھے اوی کرشنا تو بھی لے لے۔اوی مادھوی تو بھی لے۔آجا آجا جلدی، پھر کھتم ہو جائے گا۔بہو آجا تمہارے پسند کی چیج ہے۔''

''میم صاب میری بہو کو جادہ دینا یہ پیٹ سے ہے۔''

''میم صاحب مجھے دو پوریاں دینا، مجھے بہت بھوک لگی ہے۔''

اور میم صاحب مجھے چنے زیادہ دینا۔مجھے بھی بھوک لگی ہے۔''

گاڑی سے اتری عورت من ہی من میں مسکائی۔اور اپنے آپ سے کہنے لگی۔۔۔

بچارے۔۔۔۔بھوکے پیاسے۔۔۔ان کو کتنی بھوک لگی تھی۔۔۔

پل بھر میں ہی اس کا پتیلا صفا چٹ ہو گیا اور پوریاں بھی ختم ہو چکی تھیں۔اتنے میں ایک چھوٹی بچی آئی اور کہنے لگی۔

میں بھی کھاؤں گی۔مجھے بھی، مجھے بھی، مجھے بھی۔۔۔'' اپنے پاؤں زمیں پر پٹخنے لگی۔

گاڑی والی عورت پریشان ہوگئی کیونکہ اسکے پاس اب کچھ بھی نہیں بچا تھا۔وہ ادھر

ادھر دیکھنے لگی کہ اس بچے کو کیا دوں۔۔اتنے میں ایک داڑھی والے بابا نے اس کو بلایا جو شاید اسکا دادا تھا۔

"آ جا گڈی میں دونگا ادھر آ۔" بچی دوڑ کر بوڑھے کی گود میں بیٹھ گئی اور پوری جواب صرف آدھی بچی تھی اسکو چٹ کر گئی۔اور وہ عورت اسکو دیکھتی رہ گئی۔کتنی پیاری بچی ہے۔مگر نہ تن پر کپڑے پورے، نہ پیٹ میں کھانا پورا۔بال ایسے گندے جو شاید پیدا ہونے کے وقت بھی دھوئے نہیں تھے۔اور ٹانگیں اتنی کالی جیسے دنیا بھر کی گلیوں کی دھول ان پر جم چکی تھی۔

بوڑھا بھی کچھ اسی طرح کی صورت بنائے تھا۔اسکی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور اسکی داڑھی کے بال ایکدوسرے کے ساتھ ایسے جڑے تھے جیسے کسی نے ان کو کسی مایہ سے جوڑ دیا تھا۔

عورت نے اپنا پتیلا سمیٹا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔اور گاڑی چلدی۔

سورج نکل کر اوپر اوپر آنے لگا تھا اور دھوپ سر پر منڈلانے لگی تھی آہستہ آہستہ تمازت کا احساس بھی ان کو ستانے لگا تھا۔کوئی امیر پیسے والا نہیں آ رہا تھا جو ان غریبوں کے سر پر ہاتھ رکھے اور کچھ کھانے کو دے دے۔یہ پیٹ تو ایسا تنور ہے کہ اسمیں جتنی لکڑی ڈالو وہ جلتی رہتی ہے اور لکڑی ختم ہو گئی تو تنور ٹھنڈا ہو گیا۔اسے پھر سے لکڑی کی ضرورت تھی۔

"آج لوگوں کو کیا ہو گیا اماں۔آج کوئی کیوں نہیں آتا ہے۔میری تو انتڑیاں بھی سوکھ گئی۔"

"آینگے، آینگے تو بس تھوڑا سا را انتجار کر لے۔ابھی تمہارے کھانے کو کچھ آئے گا"۔

لوگ آتے گئے اور ان کے سامنے کسی نے پیسہ ڈالا کسی نے سوکھے چاول اور کسی نے سوکھی روٹی۔ان کے لفافے اور تھیلے بھرنے لگے۔مگر پیٹ ابھی بھی خالی تھا۔ظہر کی نماز کا وقت نزدیک آنے لگا اور لوگوں کا تانا باندھنے لگا۔مگر نمازی بھی صرف ان کے آگے پیسے ہی ڈالتے گئے۔

''ارے او صاحب صبح کی بھوکی ہوں۔بچے بھی بھوکے ہیں، کچھ دے دو''

''ارے او بی جی بچوں کے لئے کچھ دے دو۔''

او میم صاحب تمہارے بچوں کا بھگوان بھلا کرے، کچھ ادھر بھی ڈالو۔''

بچے بیٹھ بیٹھ کے تنگ آ گئے وہ ادھر ادھر گھومنے لگے۔ساتھ والے دکان کے پاس جو کھانے پینے کا سامان بیچتا تھا جو بھی گاہک آتے ان کو تنگ کرتے ،ان سے کبھی پیسہ،کبھی کھانے کی کوئی چیز مل جاتی تھی۔وہ بچے کبھی کسی گاہک کی قمیض کا کونہ پکڑ لیتے اور کبھی کسی گاہک کی شال۔کبھی کوئی تنگ کر ایک تھپڑ رسید کرتا، یا کوئی اپنے کھانے میں سے کچھ دے دیتا۔اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتے تھے۔

شام ہوتے ہوتے لوگوں کا رش بڑھ گیا اور لوگ تھیلوں اور بڑے بڑے برتنوں میں کھانے پینے کی چیزیں لیکر آتے تھے اور وہ ہر ایک کی پلیٹ میں ڈالتے گئے۔کچھ بچوں کے پاس پلیٹ کے بجائے لفافے تھے جو انہوں نے پلیٹ کی طرح پھیلائے تھے۔اور کچھ بچوں نے کیلوں کے پتے اپنے سامنے پھیلائے تھے۔ان کو اسی کے اوپر ڈال دیا جاتا تھا۔

اتنے میں پلاؤ کی ایک دیگچی آن پہونچی۔اور وہ بھی بوڑھی اماں کے سامنے

رکھی گئی۔سب سے پہلے بوڑھی اماں کو اس میں سے دیا گیا۔بوڑھی اماں نے دیکھا

اسکے اندر کچھ ہے۔اس نے ہاتھ سے اسکو باہر نکالا۔

آدمی ڈر گیا کہیں۔۔۔

''اماں بوٹی کھاتے ہونا۔۔۔یا۔۔۔''

ہاں ہاں کھاتے ہیں۔بڑھیا نے خوش ہو کر چلایا۔

بوٹی آئی۔۔۔بوٹی آئی۔۔۔بہو۔۔کرشنا۔۔۔مادھوی۔۔۔چھوٹی۔۔۔گڈو۔۔

۔۔۔سب آجاؤ۔۔۔دیکھو بوٹی آئی۔۔شانتی تو بھی لے لے۔۔جلدی آجاؤ

۔۔۔ کھتم ہو جائے گی۔۔۔۔۔پھر نہ کہیو۔۔۔۔''

سب کے سب دوڑ پڑے اور اپنی اپنی پلیٹیں لائی۔

''پہلے مجھے۔پہلے مجھے، پہلے مجھے۔۔۔۔۔''

''مجھے اسمیں بوٹی نہیں ہے۔مجھے بھی بوٹی دے دو۔۔ مجھے بھی بوٹی دے دو،

پلیٹوں کی ایک لمبی لائین لگی تھی۔۔۔۔

مگر دیگچی۔۔۔پل بھر میں۔۔۔خالی ہوگئی۔۔۔۔

اور کچھ پلیٹیں ابھی بھی خالی نظر آرہی تھیں۔آدمی بہت شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔۔۔

اس نے اپنی نظریں جھکالیں اور ادھر اُدھر دیکھے بِنا اس نے اپنی دیگچی اٹھائی اور

ایسے نکل گیا جیسے اس نے چوری کی ہو۔

☆☆☆

۲۳

چھت

بنگلے کے باغ میں لگاتار بارش کا پانی جمع ہونے لگا تو نغمہ کو ڈر سا لگنے لگا، سب لوگ کہتے تھے کہ اب کے بار شاید سیلاب آئے گا، مگر وہ تو کہتی تھی کہ اس متمول (posh) علاقے میں نہ تو کبھی سیلاب آیا ہے اور نہ ہی آئے گا۔ مگر اب بارشوں کا پانی اتنا زیادہ دریاؤں اور جھیلوں میں جمع ہونے لگا کہ سیلاب کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ نغمہ نے جب باغ میں پانی جمع ہوتے دیکھا تو اس نے اپنے شوہر سے کہا۔

"ذرا ہم دریا کو ایک نظر دیکھیں۔ ہمارے گھر کے نزدیک دریا ہے۔ اور ہم دریا کی سطح سے کوئی بیس بائیس فٹ نیچے ہیں۔ کہیں ایسا نہ کہ سچ مچ بارشوں کا پانی سر سے گذر جائے اور سیلاب کی صورت اختیار کرے۔"

اسکے شوہر نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا۔ "بیگم تم تو کبھی ان باتوں سے ڈرتی

نہیں ہو۔آج کیا بات ہوگئی ہے۔ ہمارا علاقہ ایسا ہے کہ اس میں کبھی بھولے سے بھی پانی نہیں آئے گا۔"

"آج ہمیں سچ مچ ڈر لگ رہا ہے۔پانچ دن کی لگاتار بارش اور ستمبر کا مہینہ۔میری ماں کہتی تھی کہ جب اگست یا ستمبر میں بارشیں بِنا تھمے گرتی ہیں تو سیلاب کی شکل اختیار کرتی ہیں۔"

دوسری صبح کو سارے محلے میں یہ شور مچا کہ دریا کا بند ٹوٹ گیا ہے اور سارے شہر کو پانی میں ڈوب جانے کا خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔

دیکھتے دیکھتے ان کے باغ میں جو پہلے سے ہی پانی پانی ہو چکا تھا پانی موجوں کی مانند آنا شروع ہوگیا۔نغمہ کا بھائی ،اس کے ماں باپ،،اسکے چاچا،سب اسی محلے میں رہتے تھے۔اگر ایک مکان کو ڈوبنے کا خطرہ تھا تو سب مکانوں کو وہی خطرہ تھا۔نغمہ کے رشتہ دار اس کو فون پر خطرے سے آگاہ کرنے لگے اور کہنے لگے کہ فوراً اپنے مکان کو چھوڑ دیا جائے۔کیونکہ آنے والا خطرہ بہت زیادہ تھا۔جب تک نغمہ اور اسکے شوہر حسین اس بات کا کوئی فیصلہ لیتے کہ گھر چھوڑ کر کہاں جائیں گے پانی کا ایک ایسا ریلا آیا جو گھر کے باغ سے سارے درخت،ساری دیواریں اکھاڑ کر لے گیا۔یہ پانی کا ریلا جیسے سمندر کا ایک حصہ تھا۔

اب تو گھر چھوڑ کر جانا مشکل تھا۔پانی انسان کی لمبائی سے اوپر آچکا تھا۔دیکھتے دیکھتے گھر کے اندر پانی چلا گیا۔ان کا گھر جنت کا ایک ٹکڑا تھا۔اس میں رہائش نہیں بلکہ آرام وآسایش کا ہر ایک سامان میسر تھا۔جہاں ایک شئے کی ضرورت تھی

وہاں دس چیزیں زائد تھیں۔ کھانے پینے کا سامان اتنا تھا کہ مہینوں انسان کھاتا تو ختم نہ ہوتا۔

گھر کی سجاوٹ، رنگ روغن، سب ایسا تھا کہ انسان کا دل لے جاتا تھا۔ مگر آج گھر کا سارا سامان، کھانے پینے کی چیزیں، سب پانی کے نیچے جانے لگا، پانی اتنی تیزی سے آنے لگا کہ سب اسی میں ڈوبنے لگا۔

ان کا مکان تین منزلہ تھا اور وہ ایک ایک منزل اوپر چڑھتے گئے اور پانی، موت کی طرح ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ جیسے موت سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر تیزی سے ان کے پاس آ رہی تھی اور وہ موت سے بچ نکلنے کی کوشش کرتے جا رہے تھے۔ موت سامنے ہو تو انسان کس چیز کی تمنا کرے۔ کسی چیز کی تمنا، کسی شئے کی خواہش نہ رہی۔ معلوم یہی پڑتا تھا کہ یہ پانی موت کی صورت لیکر کے آیا ہے اور ان سب کی جان لیکر ہی دم لے گا۔

گھر کے سارے افراد ساس، سسر، شوہر، بیٹا، بیٹی سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ کوئی کچھ نہیں بولتا تھا۔ موت کا خوف ان سب کے چہروں پر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ان کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ زندگی کا سارا کیا کرایا ایک ایک کر کے یاد آ رہا تھا۔ اندر ہی اندر دل میں اللہ سے دعائیں مانگی جا رہی تھی اور توبہ استغفار کیا جا رہا تھا۔ تیسری منزل پر آ کر نغمہ نے ماں باپ اور اپنے شوہر جو جیسے بہرا اور گونگا ہو چکا تھا اور بچوں کو جو مارے ڈر اور خوف کے روئے جا رہے تھے ایک جگہ جمع کیا۔ اور کہا۔ ''اب مرنے کا وقت آن پہونچا ہے۔ ایک جگہ بیٹھ کے اکٹھے مر جائیں

گے۔ ایک دوسرے کا کہاسُنا معاف کریں اور اللہ کا نام اور کلمہ پڑھتے رہیں اور مرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔"

اللہ تعالیٰ سے عاجزی، دعائیں اور استغفار کرتے رہے اور اب دعاوؤں نے آواز بھی پکڑ لی۔ اے اللہ اگر آج موت ہی لکھی ہے تو ایسی بدترین موت نہ دیجیو جس میں ہماری لاشیں بھی نہ ملیں۔ اگر موت ہی دینی ہے تو آرام اور سکون کی موت دے دے۔

یہ پاش علاقہ ایک پیالے کی مانند تھا جو دریا کے بند ٹوٹنے کے ساتھ ہی دریا کی سطح کے ساتھ برابر ہونے لگا۔ پچیس فٹ پانی اس پیالے میں جمع ہو گیا۔ اللہ سبحان وتعالیٰ نے دعائیں سُن لیں اور پانی کو رُکنے کا حکم دیا۔ یوں یہ سارے لوگ اپنے مکان کی تیسری منزل میں بند پڑے رہے۔ اور نیچے کی منزلیں پانی سے بھر گئیں۔ نہ باہر جانے کا کوئی راستہ تھا اور نہ ہی نیچے اترنے کی کوئی راہ تھی۔ اور نہ ہی کوئی صورت نظر آرہی تھی۔ سارے فون، موبائیل، فیل ہو چکے تھے۔ بجلی بھی فیل تھی۔ کہیں سے کوئی روشنی کی کرن بھی نہیں آرہی تھی۔ ہر طرف سمندر کا سماں بن گیا۔ نہ در کہیں، نہ دیوار کہیں، ہر چار سو پانی ہی پانی، اوپر آسمان اور نیچے پانی اور وہ پانی بھی کیسا؟ مٹیالا اور گندہ۔ اور پانی کے بہنے کی ایسی آواز جیسے آبشار بہہ رہا ہے۔

"بچاؤ بچاؤ" کی آوازیں ہر طرف سے آرہی تھیں۔ مگر بچانے کے لئے کوئی کشتی، کوئی ناو، کوئی بوٹ (boat) نظر نہیں آرہی تھی۔

پانی دیکھ کے اندازہ ہو رہا تھا کہ نغمہ کے بھائی اور اسکے ماں باپ کا مکان بھی

ڈوب گیا ہوگا۔ کیونکہ وہ تو دومنزلہ ہی تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ۔۔۔۔
اب اگر ہم بچ کے نکل بھی آئیں گے تو جائیں گے کہاں؟ سب لوگ تو عالم آب میں ہیں اور۔۔۔۔؟

اسی عالم آب میں کئی راتیں اور کئی دن گذر گئے۔ کھانے کو دانہ اور پینے کو پانی نہیں۔ پانی پانی ہر طرف تھا مگر پینے کو ایک بوند نہیں۔ آس پاس کا پانی اسقدر گندہ اور کثیف تھا۔ اور اسکے علاوہ کبھی تیل خاکی کی بو آرہی تھی اور کبھی پیٹرول کی۔ اور رنگ تو ایسا تھا جیسے کھیتوں کی ساری مٹی اس میں مل چکی تھی۔ یہی نہیں آس پاس کے تمام پاخانوں اور غسل خانوں کا گندہ پانی بھی اس میں مل چکا تھا۔ اگر انسان چاہے بھی تو حلق سے نہیں اتار سکتا تھا۔

اب جان میں سے جان نکلی جا رہی تھی۔ بھوک سے بچوں کا برا حال تھا۔ پانی کے لئے تو آنکھیں باہر نکل آئیں تھیں۔ ایک یا دو دن نہیں پورے پانچ دن اسی حال میں رہے۔

پانچ دنوں کے بعد آرمی والوں کے بوٹ پانی میں تیرنے لگے۔ ایک ایک بوٹ میں بیس بیس آدمیوں کو وہ لے رہے تھے۔ اور بچا رہے تھے۔ پانی سے نکال کر کہاں لے جا رہے تھے کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ مگر اس وقت مسئلہ یہ تھا کہ پانی کے سیلاب سے بچایا جائے۔ خدا خدا کر کے نغمہ اور اسکے گھر والوں کی باری آگئی۔ بوٹ جہاں کھڑکی کے ساتھ لگ گئی وہاں سے کھڑکی تک تین یا چار فٹ کی دوری تھی۔ سیلاب چھوڑ دے تو کہیں پانی میں گر گئے، پانی نگل ہی لے گا۔ دل میں اور بھی ڈر بیٹھ

گیا۔مرتا کیا نہ کرتا۔آگے کھائی تھی تو پیچھے کنواں تھا۔نکلتے تو بھی موت سامنے تھے اور نہ نکلتے تو بھی۔بہتر یہی تھا کہ اگر اپنے آپ کو بچاتے بچاتے موت آگئی تو بہتر تھا۔

کھڑکیوں سے چھلانگیں مار مار کے انہوں نے آرمی کشتی میں اپنی جگہ بنا ہی لی۔
آرمی کشتی میں کسی گھر کی صرف بیٹیاں تھیں، کسی کے بچے، کسی کی عورتیں اور نغمہ کے سارے لوگ۔کیونکہ انہوں نے کچھ گھروں میں مردوں کو چھوڑ دیا تھا۔ان کے گھر میں اکیلا مرد تھا اس پر ترس کھا کر انہوں نے اس کو بھی اٹھا ہی لیا۔

انہوں نے ان کو تیسری منزل سے نکال کر پانی کے سمندر سے ہوتے ہوئے، ایک بنڈ پر چھوڑ دیا، ایک ایسی جگہ پر جہاں نہ چھت تھی نہ مکان۔۔۔۔

نیچے زمین اور اوپر آسمان۔۔۔۔

نغمہ اور اسکے گھر والے، گھر والوں میں بچوں کے ساتھ اس کی جوان بیٹی۔۔۔

کہاں گذاریں گے اب رات؟؟؟؟

کہاں جائیں گے اب؟ اب تو سر پر چھت بھی نہیں؟؟؟؟؟؟

☆☆☆

تمام شد

Khamosh Aasman

Dr. Neelofar Naaz Nahvi Quadri

مصنفہ کی اشاعتیں:

-- غنی کشمیری حیات اور شاعری ۲۰۰۲ء

-- فارسی کی طرف پہلا قدم ۲۰۰۶ء

-- فارسی کی طرف پہلا قدم -- جدید ایڈیشن ۲۰۰۸ء

-- شہر ہای نور (سفرنامۂ حج) ۲۰۱۰ء

-- غنی کشمیری - جدید ایڈیشن ۲۰۱۱ء

-- فارسی کی طرف دوسرا قدم ۲۰۱۲ء

-- چنار کے برفیلے سائے - (افسانوی مجموعہ) ۲۰۱۳ء

-- خاموش آسمان (افسانوی مجموعہ) ۲۰۱۵ء

Cover Design by Haaris Quadri

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-5073-592-3